تعارف

از

سردار محمد عبدالقیوم خان
وزیراعظم آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر

تعارف

ڈفرے والے حضور باباجی رحمۃ اللہ علیہ کی
حیات مبارکہ کے بارے میں طبع شدہ کتاب کے مقدمہ کے طور پر
"تعارف" کے عنوان سے وزیر اعظم آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر
مجاہد اوّل سردار محمد عبدالقیوم خان
نے جو طویل مقالہ لکھا ہے وہ اپنی افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے تصوّف
اور رُوحانیت کے موضوع پر ایک معرکۃ الآرا دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہوتی ہے کہ جو حالات جس قدر بھی معلوم ہوتے ہیں ان کا ظاہر ہونا بھی گویا منشاءِ ایزدی سے ممکن ہے اور جو پردے میں ہیں اور جس قدر پردے میں ہیں وہ بھی اس خاص نظام کا حصہ ہیں۔

اگر یہ نہ ہوتو اس میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ حالات چونکہ انسانیت کی فلاح کا ذریعہ ہیں اس لئے مخالف طاقت بھی اس کے خلاف متحرک رہتی ہے۔ منطقی طور پر بھی یہی بات قرینِ قیاس ہے کہ اس مخالف طاقت (ابلیس) کی کوشش ہونی چاہئے کہ خدا کے دوستوں کے بارے میں اول تو علم حاصل ہی نہ ہونے دے اور اگر کسی قدر ہو بھی تو اس کو اس طرح خلط ملط کر دیا جائے کہ اس سے صحیح استفادہ کے بجائے گمراہی پھیلنے کے امکانات بھی اسی قدر ہوں۔ قرآن کریم کے مطابق یہ مخالف قوت (ابلیس) اس کوشش میں ہوتی ہے کہ خود انبیاء علیہم السلام کے معاملات میں بھی مداخلت کرے۔ اگرچہ اس کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے رد میں خدائی نظام خودبخود کارفرما رہتا ہے۔ یہ مخالف قوت انبیاء علیہم السلام کے بعد اپنا پورا زور اولیائے کاملین کے خلاف صرف کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ قرآن کریم نے بھی اس بارے میں صراحت کی ہے۔ اس بارے میں خداوند قدوس کا ارشاد بہت واضح ہے کہ:

ان عبادی لیس لک علیھم سلطان
(بنی اسرائیل: ۶۵)

ترجمہ: "میرے مخلص بندوں پر تیرا زور نہیں چلے گا"

یہ آیہ مبارکہ اس پورے فلسفے کی نہایت ہی واضح دلیل ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ اس کا زور کس پر چلے گا؟ اس کا واضح اور سیدھا جواب یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے علاوہ تمام مخلوق پر اس کا زور چل سکتا ہے۔ اس حساب سے اگر اس کا زور اولیائے کاملین کی ذات پر نہیں چل سکا تو پھر منطقی طور پر دوسرا راستہ یہ ہے کہ بزرگان سے وابستہ لوگوں کو ہدف بنایا جائے اور اس مقصد کے لئے آسان طریقہ ہے کہ بزرگانِ دین کے حالات کو ہی خلط ملط کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ صحیح اور غلط میں تمیز نہ ہو سکے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اولیائے کاملین کے حالات زندگی بیان کرنے میں اکثر لوگوں نے حد درجہ احتیاط کی ہے اور جہاں کہیں احتیاط کا دامن چھوٹ گیا وہیں اس مخالف قوت نے اثر دکھایا اور صحیح معاملہ کو کچھ کا کچھ کر دیا۔ آج تصوف کے بارے میں صحیح معلومات

کے بجائے اناپ شناپ اور گپ شپ کا ایک ایسا انبار ہے کہ اس میں سے صحیح بات دریافت کرنا شاید جوئے شیر لانے سے کم نہ ہو۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی

وہ بر گزیدہ لوگ جو اپنے قول و فعل میں توحید ہی توحید تھے ان کے متوسّلین کی خام عقل نے تاویلوں کے ایسے انبار لگا دیئے ہیں کہ توحید اور شرک میں فرق کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگرچہ تمام ادوار میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی شخص ہر دور میں ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو اس خرافات سے حقیقت کو نکھار کر جدا کر دیتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ جوں جوں زمانہ قیامت کے قریب جائے گا سچائی اور حقیقت کم ہو جائے گی اور بالاخر ایسا وقت آ سکتا ہے کہ صحیح بات کا علم ہی مفقود ہو جائے۔ آج بھی اناپ شناپ نے اس قدر رواج پکڑ لیا ہے کہ اگر اصل بات کی طرف رجوع کیا جائے تو فوراً فتویٰ لگ جاتا ہے۔ تاہم جس طرح ولی کے حالات زندگی کا بڑا حصہ پردے میں رہتا ہے اسی طرح حضور باباجیؒ کے حالاتِ زندگی بھی ہمیشہ پردے میں رہے ہیں۔ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ حضور باباجیؒ کے حالاتِ زندگی پردہ ہی پردہ ہیں۔

ڈفرے والے باباجیؒ کے بارے میں نہ صرف یہ کہ ان کی شخصیت کی مناسبت سے معلومات بہت کم ہیں بلکہ معلومات کو جمع کرنا اور پھر ان کو کسی قرینے سے بیان کرنا بدرجہا مشکل تر بلکہ ایک طرح سے ناممکن کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ ان غیر معمولی مشکلات کے علاوہ جن کا میں اس تحریر میں ذکر کروں گا حضور باباجیؒ کی عظمت، ان کی عالی ہمتی اور نہایت ہی غیر معمولی منفرد شخصیت کو بجائے خود احاطہ تحریر میں لانا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ یہی وہ احساس ہے کہ مجھے جب کوئی پوچھتا ہے کہ تم کس کے مرید ہو یا تمہارے شیخ کون ہیں؟ تو اس کا جواب دیتے ہوئے ہمیشہ ایک جھجک سی رہی۔ ایک طرف معاً ان (حضور باباجیؒ) کی شخصیت کی بلندی، جامعیت اور دوسری جانب اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس وقت یہ بھی سوچتا ہوں کہ اگر میں حضور باباجیؒ کے ساتھ اپنی نسبت کا اظہار کروں (جو اگرچہ قابل فخر ہے) تو کہیں لوگ آپؒ کی ذات کو مجھ جیسے نالائق پر قیاس نہ کرنے لگیں اور اگر انکار کروں تو یہ نہ صرف حقیقت کے خلاف ہے بلکہ خدا کی ناشکری اور کفرانِ نعمت بھی ہے۔ ویسے بھی کسر نفسی کی ایک حد ہے۔ تحدیثِ نعمت اور ناشکری کے مابین بہت بڑا فرق ہے۔

اس مشکل کی پوری وجہ کیا ہے؟ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے بلکہ غالب امکان ہے کہ حضور باباجیؒ بھی ان ہی نادر روز گار ہستیوں میں سے ہیں جن کے حالات زندگی کا بظاہر تھوڑا یا بہت کم علم ہوتا ہے اور اس علم کا دائرہ بھی خواص تک ہی محدود ہوتا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ شاید طریقت کا کوئی ایسا سلسلہ بھی ہے جس کو فطرت نے پردے میں رکھا ہو۔ یہ امر عین منطقی اور درست بھی ہے کہ سب کچھ سب پر آشکار ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ہر کوئی ہر شے کے قابل نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارا سورج ہے جو کہ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہی نہیں بلکہ دکھائی بھی دیتا ہے۔ ہمیں اس کی گرمی کا احساس و شعور بھی ہے لیکن اب یہ بھی حق الیقین کے طور پر معلوم ہے کہ خود اسی سورج سے کئی گنا بڑے کئی سیارے اسی نظام کائنات کا لازمی حصہ ہیں۔ وہ نہ تو عام طور پر دکھائی دیتے ہیں نہ ہمیں ان کا مکمل شعور ہے جب کہ ان کا وجود اس پورے نظام کا اہم حصہ ہے اور یہ نظام ان سے برابر متاثر ہوتا رہتا ہے۔ زیادہ صحیح بات تو یہ ہے کہ انسانی دنیا میں ان سیاروں کے وجود کی اہمیت کا ابھی ادھورا سا علم بھی موجود نہیں ہے۔

حضور باباجیؒ کے حالات زندگی پر میں جب کبھی غور کرتا ہوں تو مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ کئی جلیل القدر بزرگانِ دین کے حالات حضور باباجیؒ کے حالات میں تو دکھائی دیتے ہیں لیکن حضور باباجیؒ کے تمام حالات دوسری جانب دکھائی نہیں دیتے۔ تاہم ان معاملات کے بارے میں ہمارا علم چونکہ ویسے بھی محدود ہے اس لئے اس بارے میں محض قیاس سے ہی بات کی جا سکتی ہے۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ دوسروں کا مرتبہ کم کیا جائے اور حضور باباجیؒ کا مرتبہ بڑھایا جائے، جیسا کہ پیری مریدی میں عام طور پر ہوتا ہے۔ اس میں بددیانتی نہ ہو تب بھی چونکہ ہر صادق مرید کے لئے اس کا شیخ ہی سب کچھ ہوتا ہے، جس کے ذریعے سے اس کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا راستہ ملتا ہے اس لئے یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے کہ میں بھی اپنے شیخ کا مرتبہ بڑھا کر بیان کر رہا ہوں یا یہ کہ سالار صاحب نے بھی یہی کچھ کیا ہو گا۔ اکثر حضرات تو ویسے بھی آمنا وصدقنا والی روحیں ہوتی ہیں لیکن میری طرح کے نکتہ چیں اور تجسس والے لوگ آسانی سے کوئی بات قبول نہیں کرتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے شیخ نے میرے لئے تو کوئی کمی نہیں رہنے دی دوسرے حضرات کے مرتبے اور عظمت کا دلی اعتراف بھی اسی طرح ضروری

ہے۔ مگر یہ بات عوام کے لئے نہیں ہے۔ جس کو صرف ایک روٹی کی ضرورت ہے وہ دوسری کی طلب کر ہی نہیں سکتا اور اگر کرے گا تو لالچ میں مارا جائے گا اور ایک سے بھی محروم ہو گا البتہ وہ بھی ہیں جو درجنوں روٹیاں کھا کر بھی بھوکے رہتے ہیں۔ ان کی دنیا اور ہے اور ان کے لئے قاعدے اور ضابطے دوسرے ہیں۔ اوراد اور وظائف پڑھنے کا میرا شوق جب بڑھتا گیا تو ایک موقع پر حضور باباجیؒ نے فرمایا

"آپ کو عام وظائف کی اجازت ہے۔ کہیں سے بھی کوئی وظیفہ ملے تو اس کو بھی ہماری طرف سے سمجھو"

تاہم یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جس طرح کائنات کے اجزاء ہیں یا حضرات انبیاء علیہم السلام میں مراتب اور خصوصیات کا فرق ہے اور یہ سب ایک نظام کے تحت اپنے مرکز تک منتہی ہوتے ہیں اسی طرح یقیناً اولیاء اللہ میں بھی مراتب اور خصوصیات کا فرق ہونا چاہئے جیسا کہ میں نے پہلے کہا اولیاء اللہ کے بارے میں چونکہ ظاہری علم زیادہ نہیں ہے اس لئے محض قیاس سے ہی کام لیا جا سکتا ہے یا پھر خود کسی ولی کامل نے اپنے یا کسی دوسرے ولی کے بارے میں کچھ کہا ہو تو اسی بات پر اعتماد کرنا ہو گا۔ بہرحال اگر کسی شخص کو حضور باباجیؒ کی توجہ اور صحبت کا کچھ علم حاصل ہوا ہو جو سعادت یقیناً بہت لوگوں کے حصہ میں آئی اور وہ ہونا بھی چاہئے تھا (کیونکہ ان کی کوئی بھی صحبت خالی از حکمت نہیں ہو سکتی تھی) جیسا کہ انہوں نے خود فرمایا تھا کہ "غوث کے سامنے سے کوئی گزر جائے اور غوث کی نظر اس پر پڑی ہو تو وہ شخص قیامت تک اس غوث کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتا"۔ اس بات کا مفہوم بظاہر تو اور ہے مگر اس میں بہت باریک اور لطیف امر بھی ہے۔ مثلاً یہ کہ "کوئی غوث ہو، پھر کوئی شخص ان کے سامنے سے گزرے اور یہ کہ غوث کی نظر اس پر پڑی ہو۔ اس میں یہ سب باتیں بہت دقیق اور معنی خیز ہیں۔ اس میں ہر لفظ کے اپنے معنی ہیں ورنہ بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی" تو وہ علم اس طرح کا ہو گا کہ اس شخص کو محض اتنی ہی حد تک بات معلوم ہو گی جس حد تک معلوم ہونا چاہئے یا پھر یہ معلوم ہو گا کہ اسے ابھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ یہ کیفیتِ امام شافعیؒ کے اس شعر کا مصداق ہے۔

اذا ما ازددت علما زاد علما بجهلی

(ترجمہ) جوں جوں میرے علم میں اضافہ ہوا تو مجھے اپنی جہالت کا زیادہ علم ہوا

تاہم میرے کچھ اپنے تجربات اور معلومات ایسی ہیں جن کے بیان کرنے سے شاید اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکے یا اسے سمجھنے میں کسی حد تک مدد مل سکے۔ وہ تجربات اور معلومات اپنی ذات کے علاوہ ان اہل اللہ کے ذریعے سے بھی ہیں جو حضور باباجیؒ کے ہاں تشریف لاتے رہے اور حضور باباجیؒ کے بارے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ نہ کچھ ارشاد فرماتے رہے۔ اس کا ذکر حضور باباجیؒ کی شخصیت کے حصہ میں، میں انشاء اللہ کروں گا۔

عام طور پر خیال ہے کہ اہل ولایت کا انتہائی مقام غوث ہے لیکن خواص میں اس سے آگے بھی (معلوم اور نامعلوم) کئی مقامات اور مرتبوں کے بارے میں ذکر ہوتا ہے اور وہ ہونا بھی چاہئے۔ ایک بات جو انتہائی وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ ایسے مقامات کے بارے میں عام طور پر زیادہ معلومات نہیں ہیں مثلاً حضرت سلطان باہوؒ نے فرمایا ہے کہ:

"مقامِ فقر ایسا ہے کہ غوث اور قطب اس میں جھانک کر بھی نہیں دیکھ سکتے"

صاحبان اسرار جانتے ہیں کہ نظام معرفت میں یہی دو اعلیٰ مقامات ایسے ہیں (مقام غوثیت اور مقام قطبیت) جو اس پورے نظام پر محیط ہیں۔ اگرچہ اس نظام کے ماتحت نیک اور صالح لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو کائنات میں اپنے اپنے وقت اور تعداد کے مطابق موجود رہتی ہے۔ حضور باباجیؒ کے حالات زندگی اور ان کے ارشادات سے بھی اسی قسم کا گمان ہوتا ہے کہ وہ ولایت سے آگے فقر کے کسی ایسے ہی بلند مقام پر فائز تھے جس کے بارے میں زیادہ معلومات کا حصول ممکن نہیں ہے۔ ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ حضور باباجیؒ کے کچھ حالات زندگی سے (جو کسی نہ کسی بڑی کاوش سے دستیاب ہوئے) یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کا روحانی سفر شاید آخری لمحے تک مسلسل جاری رہا، یہ کہیں رکا نہیں تا آنکہ وہ رفیق اعلیٰ سے مل نہیں گئے۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد بھی یہ سفر جاری ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کرم پر کوئی حد نہیں مقرر کی جا سکتی۔ اس لئے ان کے بارے میں کوئی کیا کہے اور کیا لکھے۔

بزرگانِ دین سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ جو ولی جس مقام پر فائز ہوتا ہے وہ اپنی گفتگو میں اکثر اسی مرتبے والے دوسرے حضرات کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ درست مان

لیا جائے اور یہی یقیناً درست بھی ہے تو حالات اور واقعات سے بلاخوف تردید معلوم ہو گا کہ ہمارے باباجیؒ مقام در مقام مسلسل سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مقامات کا ذکر ان کی گفتگو کا حصہ نہیں رہا تھا۔ اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک یہ کہ ان کا سفر مسلسل جاری رہا اور دوسرے یہ کہ وہ مقامات کی حدود وقیود سے باہر نکل گئے تھے اور بقول علامہ اقبال ؎

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد　　بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است　　بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

"یعنی لمحہ بہ لمحہ تازہ بہ تازہ نقش مرتسم ہو رہے ہیں، زندگی میں جمود نہیں ہے۔ اگر تیرا آج گذشتہ کل کی مانند ہے تو پھر گویا تیرا وجود زندگی کی حرارت سے خالی ہے"۔ واللہ اعلم

اگر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس ارشاد مبارک پر قیاس کی جائے کہ:

من استوی یومین فھو مغبون

ترجمہ۔ "جو شخص دو دن ایک حالت میں رہا وہ خسارے میں رہا"۔

تب بھی نتیجہ وہی ہے۔ اگر حضور باباجیؒ کے متوسلین میں سے کسی کو اس قسم کا سفر نصیب ہوا تو وہ بے چارہ بھی کیا کہے گا کہ اس کو خود بھی کسی حتمی بات کا علم نہیں ہو گا کیونکہ اس کو بھی سفر کے دوران ایک وقت میں ایک بات حتمی لگی ہو گی تو دوسرے وقت میں دوسری، ممکن ہے کہ وہ خود تو کسی جگہ اٹک گیا ہو جب کہ حضور باباجیؒ کا سفر بلند سے بلند تر مقام کی جانب جاری رہا۔ مثنوی مولانا روم کی ایک خوبصورت تمثیل سے بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ مولانا رومؒ کہتے ہیں کہ ایک ہاتھی اندھوں کی بستی میں چلا گیا۔ ہر اندھا اس کے جسم کی اپنی تعریف کر رہا تھا۔ کاملینؒ کے بارے میں ہمارا بھی اندھوں والا ہی حال ہے۔ ہر شخص اپنی عقل وفکر کے مطابق تاویل کرتا ہے جب کہ اصل بات کا علم کم ہے۔

ہمارے اکثر رفقاء جانتے ہیں کہ ایسے کتنے ہی ساتھی ہیں جو حضور باباجیؒ کے حالات قلمبند کرنے کے بے حد خواہش مند تھے اور انہوں نے بے حد کوششیں بھی کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور تھک ہار کر کسی نہ کسی تاویل کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے۔ کوئی کہیں بے بسی اور ناکامی کا اعتراف کر کے خاموش ہو گیا تو کوئی یہ کہہ کر چپ ہو گیا کہ باباجیؒ

خود نہیں چاہتے کہ ان کے حالات زندگی قلمبند کئے جائیں۔ اکثر دوست یہ کہتے سنے گئے کہ حضور باباجیؒ کی اکثر باتیں اپنی جگہ معلوم تو ہوتی ہیں لیکن جب لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو سب بھول جاتی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے تو پھر یہ بذاتہٖ ایک حل طلب حکیمانہ مسئلہ ہے۔ میرے اپنے ساتھ خود یہی کچھ ہوتا رہا مگر اس کی جو وجہ مجھے سمجھ آئی وہ ایک تو یہ تھی کہ خیالات ابھی کسی آزمائش سے نہیں گزرے تھے اور اسی وجہ سے خام تھے۔ پختگی کے لئے استقامت شرط ہے اور استقامت کا کوئی خاص حسابی وقت مقرر نہیں ہے۔ اگر ہو بھی تب بھی ضروری نہیں کہ جس کسی کو بیش قیمت موتی مل گیا ہو وہ اس کا ڈھنڈورا بھی پیٹتا پھرے کیونکہ وہ بھی ایک طرح سے نا اہلیت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ ایسے کئی افراد ہوں گے کہ حضور باباجیؒ کے بارے میں علم تو ان کے سینے میں محفوظ ہو گا مگر وہ اس کو عام نہیں کر سکے۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جیسا کہ اس صنف کا قرینہ بتاتا ہے جو محض اپنے گردوپیش میں ہی ذکر کر کے اپنی تشفی کر لیتے ہوں گے اور وہ بھی ہوں گے جن کے بارے میں حضرت حافظؒ نے فرمایا:

"کہ آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد"

ترجمہ۔ جن کو خبر ہو گئی پھر ان کی خبر نہ ملی

یہ تو محض چند سعادت مند ہوتے ہیں جن کو کچھ کہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔

اس سے بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ حضور باباجیؒ کے حالات قلمبند کرنے والے سالار صاحب کس کس ذہنی پیچ وتاب سے گزرے ہوں گے اور کتنی اور کس کس نوع کی مشکلات سے گزر کر بالآخر حضور باباجیؒ پر کتاب مرتب کر سکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

ذہن میں ایک سوال یہ بھی لامحالہ ابھرتا ہے کہ اس ضمن میں دوسرے ساتھیوں کی کوششیں کیوں ناکام ہوئیں اور صرف سالار صاحب ہی کیوں کامیاب ہوئے؟ یہ تو بہرحال ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ باقی لوگوں کی کوششیں نیک نیتی اور اخلاص پر مبنی نہیں تھیں۔ اس پر بھی اکثر غور کرتا رہا ہوں ۔ خود اپنے آپ کو بھی شامل کر کے سوچتا رہا کہ نقص کہاں ہے اور کیا ہے؟ میرا خیال یہ ہے کہ میرے سمیت جن جن لوگوں نے یہ خواہش یا کوشش کی ہم سب کا ارادہ اور خواہش اصلاً یہ تھی کہ ہم حضرت باباجیؒ کے محاسن بیان کریں۔

اگرچہ یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ یہ خواہش بھی محض فطری ہے۔ ہر شخص اپنی پسندیدہ بات کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ حسن کا اظہار تو کائنات کی بنیادی خصوصیت ہے لیکن پھر یہ خیال بھی لازمی تھا کہ جب دوسرے بزرگانِ کرام کے حالات لکھے گئے ہیں تو ہمارے حضور باباجیؒ کے حالات کیوں نہ قلمبند کئے جائیں؟ یہ بھی اخلاص کے منافی نہیں ہے تاہم یہ خواہشات کتنی ہی نیک کیوں نہ ہوں، اس پر اگر بامقصد طریقہ سے غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ایک طرح سے خود اپنی ہی خواہشِ نفس کی تسکین کرتا ہے۔ لیکن یہ بات تو اولیائے کرام کے ہاں بالعموم اور حضور باباجیؒ کے ہاں بالخصوص انتہائی معیوب ہے۔ ایسی صورت میں انسان، محض اپنی خواہش کی تکمیل کر رہا ہوتا ہے۔ نہ تو تحدیثِ نعمت ہوتی ہے اور نہ کماحقہٗ واقعات کو قلمبند کرنا اور نہ اس کی اصل ضرورت کا تعیّن، دونوں باتیں صرف اسی صورت میں ممکن ہیں کہ دل میں تحدیثِ نعمت کے سوا کچھ نہ ہو یا واقعات کو بے لاگ بیان کرنا دل میں اس طرح راسخ ہو کہ اس میں کسی قسم کی ظاہری یا پوشیدہ کوئی بھی دوسری غرض شامل نہ ہو۔ ایک تیسرا امر بھی ہے کہ کسی دل پر القا کیا گیا ہو کہ وہ ایسا کرے۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقے سے انصاف ممکن نہیں ہوتا اور بے انصافی اہل اللہ کے ہاں مردود ہے۔ ایسی صورت میں نفسِ مضمون کے ساتھ بھی کسی صورت انصاف ہو سکتا ہے۔ نہ مبالغہ آمیزی افراط وتفریط یا کمی و بیشی سے بچا جا سکتا ہے۔

سالار صاحب کو جس چیز نے اس مہم پر آمادہ کیا اور وہ بحمد اللہ کامیاب بھی ہوئے وہ یہی ہے کہ ان کی نیت میں مقصد نہ تو حضور باباجیؒ کی تعریف وتوصیف تھی نہ ان کے نزدیک باباجیؒ کسی تعریف کے محتاج تھے۔ اور نہ یہ کہ خواہ مخواہ ان کے حالات زندگی کو لوگوں تک پہنچانا ضروری تھا۔ جس طرح کئی دوسرے مرید اپنے بزرگوں کے بارے میں کرتے ہیں اور اسی سے یہ کہاوت ہو گئی کہ پیر خود تو نہیں اڑتے مگر مرید ان کو اڑاتے رہتے ہیں۔ سالار صاحب کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے محض ایک فطری ضرورت کو پورا کیا ہے۔ حضور باباجیؒ کی حیاتِ مبارکہ، آپ کے اعمال وافعال اور ارشادات و ہدایات، یہ سب ایک طرح سے ایسا قیمتی ورثہ ہے کہ جسے سب سے پہلے حضورؒ کے لواحقین تک پہنچنا چاہئے پھر اس ورثہ کے ان متعلقین تک جو اسے پڑھ سن کر اپنے ایمان تازہ کریں گے اور فیض بھی حاصل کریں گے۔ خاص کر اس خاندانِ عالیہ کے بعد میں تشریف لانے والے

حضرات جن کو حضور باباجیؒ کی حیاتِ مبارکہ میں راہنمائی کی فطری تلاش ہو گی۔ ان کے لئے یہ مواد کامل رہبری کا کام دے گا۔ حضور باباجیؒ چونکہ بالجسم موجود نہیں ہیں اس لئے ان کے حالاتِ زندگی میں ہی وہ راہنمائی مضمر ہے۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض حضرات کی راہنمائی اس کے بغیر بھی بلاواسطہ ہوتی رہتی ہے تاہم ایسا شخص جس کی غرض محض یہ ہو تو اندازہ کیجئے کہ پھر وہ کیوں نہ اس مبارک کام کا مستحق ٹھہرے اور کیوں نہ اس کو اس کام کی توفیق ہو۔ بقول حضرت علامہ اقبال ؎

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا "کچھ اور" ہے۔

اس میں "کچھ اور" کا بھی مفہوم ہو گا۔ کیونکہ اس کام کا ہو جانا ہی خود اس کی بہت بڑی جزا ہے اور شاید اس سے بڑھ کر کسی بھی معاملہ میں بالعموم اور دینی و روحانی معاملات میں بالخصوص شرح صدر ہونا بھی بذاتِ خود ایک اہم معاملہ ہے۔ حضرات صحابہؓ کرام کی حیاتِ مبارکہ میں بھی ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں مثلاً جمع قرآن کا واقعہ، ارتداد کا واقعہ۔ دوسرے اسی قسم کے کئی ایک واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ بعض معاملات میں شرح صدر کا ہونا (یا نہ ہونا) نہ صرف ضروری ہے بلکہ بے حد اہم ہے۔ اب یہ کہ شرح صدر کس کو ہوتا ہے، کیوں نہیں ہوتا اور کیسے ہوتا ہے؟ ان سب سوالات کا کوئی منطقی اور ریاضی کے طریقہ سے جواب دینا شاید ممکن نہیں ہے۔

یہ تحریر جو میں اس وقت قلمبند کر رہا ہوں اکثر صبح کے آٹھ بجے کے لگ بھگ کی ہے۔ اگرچہ یہ وقت ارادتاً اور عادتاً بھی کچھ نیند کرنے کا ہوتا ہے لیکن جب طبیعت خود بخود اس طرف آمادہ ہو جاتی ہے تو پھر چارہ کار ہی نہیں رہتا۔ اسکو بھی میں منجانب اللہ ہی سمجھتا ہوں۔ یہ بھی غالباً شرح صدر کا ہی حصہ ہے۔ اس تحریر کا بیشتر حصہ اسی کیفیت میں لکھا گیا ہے۔ مگر ایک تو میرا اپنا یہ حال رہا ہے کہ سالہا سال تک دوستوں نے کہا بھی اور کوشش بھی کی کہ حضور باباجیؒ کے بارے میں اپنی معلومات قلمبند یا بیان کروں مگر کئی سال کی اس کشمکش کے باوجود کامیابی نہ ہوئی۔ جب کبھی میری طبیعت کچھ کہنے سننے کی ہوتی اور اس وقت کہ وہ سب کچھ میسر ہوتا بھی تو ذہن سے سب کچھ محو ہو جاتا۔ اس سے مجھے اس بات کا احساس بھی ہوا کہ انسانی حافظہ کے بارے میں بھی کچھ لکھا جائے۔ بہرحال مدتوں کی کشمکش اور سالار صاحب کے اصرار اور ان کے ساتھ مسلسل وعدے وعید کے بعد ایک دن

اچانک سالار صاحب کے ساتھ محفل جم گئی اور میں نے حضور باباجیؒ کی صحبت میں گزرے ہوئے بعض لمحات حافظے سے بر آمد کر کے ٹیپ ریکارڈر پر منتقل کر دئے اور پھر سالار صاحب نے اس کو لکھ لیا۔ اسکا تذکرہ خود اس کتاب میں موجود ہے۔

سالار صاحب کا دوسرا اصرار یہ رہا کہ میں ان کی مرتب کردہ کتاب پر تعارف کے طور پر کچھ لکھوں۔ اس کے لئے پھر اسی کشمکش سے گزر رہا ہوں۔ عرصہ تک ہمت نہ پڑی۔ یہ کہنا کہ وقت نہیں ملتا محض بہانہ ہی ہوتا ہے۔ جب لکھنے کا صحیح وقت آ جاتا ہے تو کوئی دوسرا امر مانع نہیں رہتا۔ طبیعت بھی درست ہو جاتی ہے۔ وقت بھی نکل آتا ہے اور ماحول بھی میسر آ جاتا ہے۔ میرا تجربہ تو یہی ہے۔ چنانچہ کافی دیر بعد اچانک طبیعت میں وہ نکات ایک ایک کر کے جمع ہو گئے جو اس تعارف کا موضوع ہو سکتے ہیں۔ سالار صاحب کو بھی دکھائے تو اتفاق ہو گیا۔ اس کو بھی ایک عرصہ گزر گیا اور آج یہ سطور لکھنے کی توفیق ہوئی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تمام تر توفیق اسی کے دست قدرت میں ہے۔

وما توفیقی الا باللہ

یہ مشکل کیوں پیش آئی یا آتی ہے؟ (جس کسی کو بھی آتی ہے) یہی اصل میں اس تحریر کا نکتہ اول ہے۔ اس میں چند گزارشات ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس میں جوابدہی کا ایک بڑا سنگین مسئلہ ہے جس کو بالعموم نظرانداز کیا جاتا ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے برعکس اولیاء اللہ اگر کسی بات کا ذکر کریں تو اس کو قلمبند کرنے میں بھی اپنی ایک مشکل ہے مثلاً یہ کہ جو کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں وہ بالعموم اسی خاص مجلس سے ہی متعلق ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس مجلس میں بھی ہر بات ہر شخص کے لئے نہیں ہوتی بلکہ ایک خاص شخص اور مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جو سرکار والا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد:

"لا یعرفھم غیری"

کے مصداق ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس موضوع اور گفتگو کا تعین بھی وہ خود نہیں کرتے بلکہ وہ ان پر وارد ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح دوسرے حضرات غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ ان کے مخاطب ہوتے ہیں بالکل ضروری نہیں ہے کہ وہ ان ارشادات کو منتقل کرنا ضروری سمجھیں۔ شاید ان کے لئے وہ ضروری بھی ہو اور وہ جو اس کے اہل بھی نہ ہوں۔ یہ مقام صرف انبیاء علیہم السلام کا ہے کہ وہ جو کچھ

کہیں یا کریں اس میں ان کی اطاعت و اتباع کی جائے۔ ولیوں کے بارے میں حضرت سید علی ہجویری المعروف حضرت داتا گنج بخشؒ کا ارشاد ہے کہ "وہ جو حکم دیں وہ کیا جائے، جو وہ خود کریں اس کی نقل نہ کی جائے۔"

حضرت داتا گنج بخشؒ نے تو اس طرح نقل کرنے کو سختی سے منع کیا اور صحیح بھی یہی ہے ورنہ گمراہی پھیلنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ولی تو کسی خاص کیفیت کے ماتحت اضطراری حالت میں کچھ کر رہے ہوتے ہیں جس پر ان کو اپنا اختیار نہیں ہوتا اور اس وجہ سے ان پر قانون کا اطلاق بھی اسی مناسبت سے ہو گا لیکن دوسرا شخص جو اس کیفیت کا حامل نہیں ہے وہ اگر نقل کرے گا تو اس نے ناجائز کیا۔ اس میں بھی مزید کئی بحثیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تصوف کے مختلف رہنماؤں کے مختلف اقوال ہیں جن میں اپنے حال کے مطابق مقصد کو تلاش کرنا چاہئے۔ بعض کاملین سے ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو بظاہر ان کے مرتبے کے شایانِ شان نہ تھیں لیکن دیکھنے والے جاہلوں نے اسی کو عین دین سمجھ لیا۔ یہ لمبی بحث ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

جوابدہی کا مسئلہ بہرحال بڑا نازک ہے۔ بعض لوگ محبت کی وجہ سے توازن نہیں رکھ سکتے بالکل اسی طرح اختلاف کی شدت میں توازن نہیں رہتا اور لوگ حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ گمراہی دونوں طرف ہو جاتی ہے۔ محبت اور مخالفت میں۔ البتہ نبیوں کی ذات اس سے مبرا ہے بلکہ ان کی محبت ہی اصل ایمان ہے۔ مگر وہاں بھی ادب کے قاعدے اور ضابطے درجہ بدرجہ ہیں۔ جب کسی کو اپنے شیخ سے محبت ہوتی ہے تو وہ ہر اچھی بات کو شیخ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ خواہ وہ (شیخ) خود اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔ ایسے میں یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ قیامت کو اس شیخ پر بھی تو سوال ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کیوں تمہاری ایسی غلط تعریف کرتے تھے اور ایسی ہر تعریف جس کی حقیقت معلوم نہ ہو غلط ہو گی۔ اگر کسی کو شیخ کے بارے میں صحیح علم ہو جائے تو وہ خود بھی شیخ کی طرح ہی ہو جائے گا۔ پھر تعریف کر ہی نہیں سکے گا۔ تعریف کرنے میں غلو کے خطرات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ لوگ کیوں آپ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے تو پھر ظاہر ہے ولی اور غیر ولی سب سے یہی سوال ہو سکتا ہے۔ جواب اور اس کا نتیجہ جو ہو گا سو ہو گا مگر اس سے پہلے اس سے بھی بڑھ کر ایک مشکل مقام ہے جس سے بچنے کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام بھی دعا فرماتے تھے۔ اس کے بارے میں سیدہ

عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حساب میں آسانی سے کیا مراد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا

من نوقش الحساب یوم القیامۃ عذاب
(رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ۔ قیامت میں جس کو طلب کیا گیا اور حساب کی چھان بین کی گئی وہ مارا گیا۔

میں نے صدارت کے زمانے میں ایک سرکاری اہل کار کو بلا بھیجا۔ غرض اس کو اپنے ہاں اعلیٰ منصب دینے کی تھی۔ بقول اس کے جب تک اس کو بتا نہ دیا کہ کیوں بلوایا ہے وہ پریشان رہا کہ نہ معلوم طلبی کیوں ہوئی ہے۔ جو لوگ اپنے شیخ کی عقیدت میں کئی کئی القاب و خطابات بے مہابا جاری فرماتے ہیں ان کو یہ یاد نہیں رہتا کہ وہ خود بھی جوابدہ ہیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر ان کے شیخ کو قیامت میں اسی طرح کی تعریف کے لئے طلب کیا گیا تو وہ بے چارا ان کے گناہ میں خواہ مخواہ مارا جائے گا۔ اس تعریف پر راضی ہوا یا چشم پوشی کی، دونوں صورتیں خطرناک ہیں۔ چاہے بعد میں خلاصی ہو جائے۔ مگر پریشانی کے ایک عالم سے تو بہرحال گزرنا ہو گا۔ ایسا ہی ایک واقعہ ہمارے ایک ساتھی کو پیش آیا۔ اس نے جوشِ خطابت اور محبت میں حضور باباجیؒ کو خط میں جنیدِ وقت، ثانی بایزیدؒ اور قطب الاقطاب وغیرہ" کے معروف خطابات سے مخاطب کیا۔ کہتے ہیں کہ جب کسی وقت وہ شخص خود حضور باباجیؒ کو ملنے آیا تو آپؒ نے وہ خط نکال کر اس کے سامنے رکھا اور پوچھا "یہ خط آپ نے لکھا ہے"؟ اس نے کہا "جی ہاں"۔ آپ نے پوچھا "آپ کو معلوم ہے کہ جنیدؒ اور بایزیدؒ کے مقامات کیا ہیں؟" اس نے کہا "نہیں!"۔ آپؒ نے پوچھا "آپ کو معلوم ہے کہ میرا کوئی مقام ہے" اس نے کہا "نہیں!"۔ آپؒ نے فرمایا "تو پھر جھوٹ لکھنے کی کیا ضرورت ہے"۔ یہ بھی سنا ہے اس پر آپ کی ناراضگی کا ایسا اثر ہوا کہ عرصہ دراز تک ان صاحب کا وہ ذوق و شوق سب ختم ہو گیا۔ بلکہ اپنے معمولات کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس میں ایک دوسری بات بھی ہے۔ اگرچہ یہ بات حضرت انبیاء علیہم السلام کے لئے مخصوص ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اتباع کرنے والوں تک اس کا اثر ضرور پہنچتا ہو گا۔ سرکار والا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار
(رواہ البخاری)

ترجمہ۔ ”جس نے مجھ سے کوئی غلط بات منسوب کی (یعنی خواہ وہ اچھی ہی کیوں نہ ہو) وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔“

یہی وجہ ہے کہ محدثین حضرات نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں کچھ لکھتے یا بیان کرتے وقت (انسانی عقل میں آنے والی) ہر قسم کی احتیاط کی اور تمام حدود پوری کیں۔ میرا اپنا گمان یہ ہے کہ حضور باباجیؒ چونکہ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں کامل تھے اس لئے اسی نسبت سے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت و عشق میں بھی انہیں ایک حیثیت ہو گی۔ عقل و شواہد سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے تو پھر اسی نسبت سے حضور باباجیؒ کے خیالات اور عمل کا پرتو آپ کے ساتھیوں پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ انسانی تاریخ یہی بتاتی ہے۔ نہ صرف انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام بلکہ دوسرے اہم لوگوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ حضور باباجیؒ نے کسی وقت اس قسم کی یا کوئی اور مبالغہ آمیزی محسوس کر کے اللہ تعالیٰ سے آرزو کی ہو کہ ان کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو (اللہ تعالیٰ) اس جواب دہی سے بچائے۔ حضور باباجیؒ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے اور پھر ان کو عام کرنے کی کوششیں کامیاب نہ ہونے کا شاید ایک بڑا سبب یہ بھی ہو۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ حضور باباجیؒ پر چونکہ اویسیّت کا غلبہ تھا اس لئے آپ کے اکثر معاملات عوام و خواص دونوں سے پردے میں رکھے گئے ہوں۔ یہ پردہ دراصل اس سلسلہ کی امتیازی خصوصیت بھی ہے۔ چنانچہ سالار صاحب جب کبھی اس تالیف کا ذکر کرتے ہیں تو وہ یہی کہتے ہیں کہ اس تحریر کا مقصد حضور باباجیؒ کی آنے والی نسل ہے جو حضورؒ کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کی والہانہ خواہش کریں گے اس طرح وہ لوگ بھی اس کے مخاطب ہیں جو حضور باباجیؒ کے حالاتِ زندگی جاننے کی مسلسل خواہش کرتے رہے۔ جب ہر کوئی اپنے تجربات بیان کرتا ہو تو پھر ان سب کو یکجا کرنے کی خواہش محض فطری ہے۔

سالار صاحب نے جس محنت، لگن بلکہ عشق کے ساتھ یہ حالات و واقعات جمع کئے ہیں اور پھر ان کی صحت کا جو اہتمام کیا ہے وہ ہمارے کسی دوسرے ساتھی کے بس کی بات نہیں تھی اور نہ یہ کوئی معمولی بات ہے۔ اس کوشش میں علم، معلومات، مقصدیت، لگن، شوق اور پھر اس سب سے بڑھ کر شرح صدر بہت ہی اہم عنصر ہے اب یہ کہ یہ سعادت

ہم سب میں سے صرف سالار صاحب کے حصہ میں آئی۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم سب لوگ دوسرے روزمرہ کے کاموں کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی کرنا چاہتے تھے جب کہ اس کام کی نوعیت کا تقاضا یہ تھا کہ زندگی کے دوسرے تمام کاموں سے دل ودماغ کو فارغ کر کے صرف اسی پر لگایا جائے چنانچہ جس کسی نے بھی اس قسم کے اہم موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے وہ زندگی میں دوسرا کوئی کام نہیں کر سکا۔ یوں بھی اس کام کی نوعیت اور اہمیت کا تقاضا بھی ہے کہ اس کے ساتھ کسی بھی دوسرے شغل کو شامل نہ کیا جائے۔ اس کے لئے ذوق، شوق، وقت اور محنت ایسی بنیادی شرائط ہیں کہ اگر ایک نہ ہو تو اس کمی کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ سالار صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یقیناً ان شرائط پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ بات وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو اس بارے میں سالار صاحب کے ساتھ مجلس کرنے اور ان کی کوششوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ ان شرائط کے علاوہ اس قسم کے کام کے لئے جو طبعی لطافت اور باریک بینی چاہئے وہ بھی سالار صاحب کا ہی حصہ ہے اور وہ ان کو وافر عطا ہوا ہے (یہ خدا کا شکر ہے)۔

احتیاط، لطافت اور باریک بینی کی بات مثال کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ ان کی طبیعت میں یہ کس قدر ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ سالار صاحب اپنے پیرخانہ میں کھانا کھا کر بہرصورت ہاتھ دھوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ بات معیوب بلکہ شاید گناہ سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ پیرخانہ کے کھانے کا اثر ہاتھوں پر ہو اور وہ ہاتھ کسی دوسری جگہ جا کر دھوئے جائیں۔ وہ اسے بے ادبی سمجھتے ہیں۔ یہ وہ باریکی اور احتیاط ہے جو غالباً سالار صاحب کا ہی حصہ ہے۔ اگرچہ ہمارے دوسرے ساتھی بھی اپنے طور پر کئی باریکیوں سے متصف ہیں تاہم یہ لطافت اور باریکیاں خود حضور باباجیؒ کی طبیعت کا حصہ رہی ہیں ان (حضور باباجیؒ صاحب) کی باریکیوں تک تو رسائی شاید ممکن ہی نہ ہو۔ ان کی لطافت کا اگر تنہا ذکر کیا جائے تو ایک کتاب آسانی سے مرتب ہو سکتی ہے۔

پروپیگنڈے اور پبلسٹی کے لئے تو بہت کتابیں لکھی گئی ہیں اور کئی لوگوں نے تو یقیناً "بزورِ زر پدر را اولیاء کرد" کا کام بھی کیا ہے۔ لیکن موضوع اور صاحبِ موضوع کے ساتھ انصاف تب ہی ممکن تھا کہ زندگی کے واحد مشن کے طور پر اس کا بیڑا اٹھایا جاتا (ہمارے تمام جاننے والے تصدیق کریں گے) بحمد اللہ سالار صاحب کو شاید اللہ تعالیٰ

نے اسی کام کے لئے پیدا کیا تھا۔ جس محنت، لگن، جانفشانی اور خلوص سے انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس کام پر صرف کیا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے انہیں جزائے خیر دے۔ آمین۔

اسی طرح ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ جو ولی جتنا بڑا ہو گا یعنی جس کو اللہ تعالیٰ کا جتنا قرب حاصل ہو گا اس کی شخصیت اتنی ہی جامع اور وسیع ہو گی۔ یعنی اس کی شخصیت کی کوئی ایک نہیں، بیک وقت کئی جہتیں ہوں گی۔ نیز جب تک کوئی دوسرا شخص اتنا ہی بڑا ولی نہ ہو وہ اس کی شخصیت کا مکمل احاطہ نہیں کر سکے گا اس لئے جو کچھ وہ دوسرے بڑے کامل کے بارے میں کہے گا وہ درحقیقت انہی استعداد کے مطابق ہی اظہار کر رہا ہو گا۔ "ولی را ولی می شناسد" لیکن بالکل ضروری نہیں ہے کہ وہ کامل کی پوری بات کا احاطہ کر سکتا ہو۔ یہ بھی معلوم ہے اور (میرا اپنا تجربہ بھی یہی ہے) کہ کاملینؒ بسا اوقات ایک ہی واقعہ کو مختلف اوقات اور مجالس میں مختلف پیرائے میں بیان فرماتے ہیں۔ خود سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی یہی ہے۔ احادیثِ مبارکہ کی تاویلات میں اس قدر ردوکد کا بنیادی سبب غالباً یہی ہے تاہم یہ بالکل واضح ہے کہ اگر کہنے والا خود ولی نہیں ہے تو وہ محض اتنی ہی بات کرے گا جتنی وہ دیکھے گا، سنے گا، محسوس کرے گا یا جس کا اسے شعور ہو گا اور کوئی بھی غیر ولی جو کچھ کہے گا عام حالت میں وہ درست بھی ہو تو اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کہنے والے کو اس بات کا کماحقہٗ علم نہیں ہے۔ اس لئے کاملین کے بارے میں کوئی بھی بات کہنا ایسی بڑی ذمہ داری ہے کہ جس کا عام طور پر احساس نہیں کیا جاتا۔ اولیائے کرام کے حالاتِ زندگی بیان کرتے وقت اکثر لوگ ان کی کرامتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ کرامت اور استدراج میں فرق نہیں کرتے جس میں بظاہر بہت باریک فرق ہے۔ عام لوگ تو عموماً استدراج کی طرف جلد مائل ہو جاتے ہیں اور اسی کو کرامت یا ولایت خیال کرنے لگتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ استدراج کے بھی مختلف گروہ، درجات یا طبقات ہیں مثلاً ایک طبقہ ایسا ہے جو جنّات اور شیاطین کی تسخیر کا عمل کرتا ہے۔ ان کو بھی اکثر لوگ ولی ہی شمار کرتے ہیں بعض لوگ تو غلطی سے اسی کو عین ولایت اور معرفت سمجھتے ہیں۔ درحقیقت یہ سب محض شیطانی کاروبار ہوتا ہے (جو سراب کی طرح ہے) اس کے علاوہ ایک طبقہ وہ ہے جو نہ ولی ہوتے ہیں اور نہ شیطانی عمل والے بلکہ اسماء الٰہی اور ان کے متعلقات کے عامل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں بھی

دوسرے لوگوں کو مسخر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگوں کو ہی نہیں بلکہ چرند، پرند اور جنات و شیاطین اور مئوکلات وغیرہ سب کو مسخر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ناسمجھ لوگ ان کو بھی ولیوں میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ مسخر کرنے کے عمل کا اثر بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس میں انسان، جنّات، شیاطین، زمینی فرشتے بلکہ چرند، پرند، نباتات و جمادات تقریباً سب ہی قسمیں شامل ہیں۔ مگر روحانی تسخیر کا دائرہ تو اتنا وسیع ہے کہ کچھ کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ چاند ٹکڑے کرنا بھی تو تسخیر ہی تھی اور ابھی کیا معلوم ہے کہ سرکار والا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اس سے اور زیادہ کس قدر کمالات کے حامل تھے جیسا کہ وہ یقیناً تھے۔ چاند کی دنیا تو بہت نیچی ہے۔ ابھی سدرۃ المنتہیٰ پھر اس سے آگے اور پھر اس سے بھی آگے خدا جانے کہاں تک۔ ایک اور طبقہ علم الحروف اور ابجد کا عامل ہے۔ اگرچہ یہ بھی بڑے کمالات کے حامل ہوتے ہیں مگر ولایت اور معرفت سے ان کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا چونکہ حضور باباجیؒ صاحب کے ہاں اس طرح کے کئی لوگ آتے رہے ہیں اس لئے ان کے بارے میں بھی ہر ایک ملنے والے کو کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل ہیں۔

اس تحریر کا دائرہ چونکہ محدود ہے اس لئے اپنے ان تجربات کا ذکر کرنا بے محل ہے جو کسی حد تک استدراج، شیطانی علوم، اسماء الٰہی، ان کے متعلقات اور دوسرے علم کے بارے میں ہیں اور جن سے مجھے بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ نہ کچھ واسطہ پڑتا رہا تاہم اس حوالہ سے یہ کہنا مقصود ہے کہ جب کوئی شخص حضور باباجیؒ کے سامنے کسی کی کرامت بیان کرتا تو (میں نے اکثر سنا) وہ سن کر فرماتے۔

"ہاں ٹھیک ہے مگر اصل بات کچھ اور ہے"

اس وقت تو یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی غیر معمولی باتوں کے علاوہ اور اصل بات کیا ہے ویسے بھی ان سب باتوں کو سمجھنے کی نہ تو ہر شخص کو ضرورت ہے نہ ہی صلاحیّت اور نہ یہ سب کا حصہ ہے اور نہ ہی اس پر خواہ مخواہ وقت صرف کیا جانا چاہئے جس کا اس میں کچھ حصہ ہے۔ انہیں کسی نہ کسی ذریعے سے اپنے اپنے وقت پر اصل بات اپنی استعداد کے مطابق سمجھ میں ضرور آ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ برحق ہے۔

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"
(العنکبوت۔ ۶۹)

ترجمہ۔ "یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مخلصانہ کوشش کرتے ہیں
ہم ان کو ضرور اپنی راہیں دکھاتے ہیں۔"

اور اسی کو حضرت علامہ نے اس طرح فرمایا تھا۔

در طلب کوش ومدہ دامنِ امید زِ دست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

اور میاں محمدؒ صاحب نے اس سلسلہ میں فرمایا تھا۔

لوڑن والا رہیا نہ خالی لوڑ کیتی جس پکی

یہ بحث طویل ہے۔ اگر سمجھ میں آ جائے تو آسانی سے آ جاتی ہے اور نہ آئے تو عمر بھر مطالعہ کرنے سے بھی اس کا کوئی سرا نہیں ملتا۔ مثلاً یہ کہ ولایت و معرفت کی جو اصطلاحات استعمال ہو رہی ہیں ان کی کوئی اصل بھی ہے؟ اور اگر یہ حقیقت ہیں تو پھر محدود یا پوشیدہ کیوں ہیں؟ سب لوگوں کو اس سے استفادہ کا موقع کیوں نہیں ملتا؟ غرضیکہ درجنوں ایسے سوالات ہیں جن کے بارے میں انسانی عقل جاننا تو ضرور چاہتی ہے مگر اس میں مشکل یہ ہے کہ وہ امور اس مقام پر سمجھ میں آنے لگتے ہیں جہاں ظاہری و بشری عقل کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی کو غالباً علامہ نے فرمایا کہ:

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

جب کسی کے لئے حضور باباجیؒ صاحب یہ فرماتے تھے کہ اصل بات کچھ اور ہے تو اس کا مفہوم بھی شاید اسی قسم کی بات ہو یا اس سے بھی سوا۔ واللہ اعلم۔ تاہم اس ضمن میں دو باتوں کا ذکر ضروری ہے!

۱۔ ایک یہ کہ جس طرح کائنات میں وہ چیزیں جو دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہیں، ان سب کا یا ان میں سے کسی ایک کا بھی مکمل علم ابھی تک انسانی عقل کو میسر نہیں ہے۔ ایک سورج کی ہی مثال لے لیجئے۔ اس کے بارے میں بہت کچھ علم ہونے کے باوجود ابھی مکمل علم نہیں ہے۔ اسی طرح زندگی کے وہ شعبے ہیں جو عالم محسوسات سے ماوراء ہیں ان کا علم بھی مکمل تو کیا ادنیٰ سا بھی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ رُوح کے بارے میں خود قرآن کریم کی اس بات پر غور کریں کہ:

"یسئلونک عن الروح۔ قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔"

ترجمہ۔ آپ سے روح کے بارہ میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے روح امر ربی ہے اور تمہیں (اس کا) تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے علاوہ تمام مخلوق کا علم قیامت تک اکٹھا کیا جائے تب بھی وہ روح کے بارے میں علم کا محض قلیل حصہ ہی بنتا ہے اس سے لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ روح اور روحانیّت کے بارے میں جس قدر جستجو وغیرہ ہے وہ سب ملا کر بھی انسان بمشکل ادنیٰ سے حصے تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اس سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وٗ آلہٖ وٗسلّم کی عظمت کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے کیونکہ یہ جو قلیل کا خطاب ہے، قرینہ بتاتا ہے کہ بقیہ مخلوق کے لئے تو یقیناً ہے مگر (حضور صلی اللہ علیہ وٗ آلہٖ وٗسلّم کے لئے نہیں ہے) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وٗ آلہٖ وٗسلّم اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۲۔ اگر اس قرینے سے دیکھا جائے تو انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کا وجود نظامِ کائنات کا لازمی اور شاید اہم ترین حصہ ہے اس لئے کہ کائنات میں خرابی یا شر کی جو لازمی صلاحیت موجود ہے اس کا دوسرا پہلو یعنی اس کی اصلاح یا خیر کی صلاحیت بھی تو موجود ہونی چاہئے کیونکہ کوئی چیز تنہا نہیں رہ سکتی۔ ورنہ کہا جا سکتا ہے کہ معاذ اللہ یہ نظام ناقص ہے اور بنانے والی طاقت بھی خود اسی تناسب سے ناقص ہو گی۔ اصلاح کا یہی وہ پہلو ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام سے عبارت ہے اور ان کے بعد یا ان کے ساتھ اولیاء اللہ کے وجود سے۔

میں جب کبھی حضور باباجیؒ صاحب کے حالات پر غور کرتا ہوں تو میرا خیال شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس فلسفہ کی طرف چلا جاتا ہے جس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سب سے بلند صفت اس کو قرار دیا ہے جس کو

"مدبر السموٰت والارض"

کہتے ہیں اور وہی صفت حکمت کا بھی مقصود معلوم ہوتی ہے۔ حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وٗ آلہٖ وٗسلّم کے حالات زندگی پر غور کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وٗ آلہٖ وٗسلّم اللہ تعالیٰ کی اس بلند ترین صفت کے مظہر کامل تھے۔ یہ شعر شاید اسی حقیقت

کی وضاحت کرتا ہے۔ ؎

حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

ایسا ہی حال اولیائے کرام کے احوال سے بھی ملتا ہے۔ ان کے حالات میں بھی انبیاء علیہم السلام کے حالات کا پرتو اور نسبت دکھائی دیتی ہے۔ منطقی طور پر بھی یہ ضروری ہے کیونکہ اولیائے اللہ کا وجود انبیاء علیہم السلام سے اگر علیٰحدہ ہو تو یہ فساد کا موجب ہو گا اور علیٰحدہ نہ ہو اور وہ نبی بھی نہ ہوں تو پھر اس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے کہ وہ سب لوگ حضرات انبیاء کے متبع و مطیع ہونے چاہئیں اور اگر ایسا ہو تو پھر وہ سب ان حضرات گرامی کی صفات سے بھی متاثر ہونے چاہئیں۔ اس طرح اپنی اپنی استعداد اور فطری صلاحیت کے مطابق ان پر ان عظیم ہستیوں کا پرتو ہونا لازم آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر اسی استدلال سے نسبتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ہی سب پر فوقیت حاصل ہونی چاہئے۔ وہی سب سے جامع شخصیت بھی ہو گی۔ حضور باباجیؒ صاحب کے حالات پر جب کبھی میں نے غور کیا تو مجھے لامحالہ وہی

"مدبر السموٰت والارض"

کی نسبت نمایاں دکھائی دی جس کا مظہر اتم ذات محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہیں۔ اس حساب سے پھر نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے کہ جو ولی جتنا ذات محمدیؐ میں گم ہے اس کی شخصیت اتنی ہمہ گیر ہے اور وہ تدبیر اور حکمت کی دولت سے اتنا ہی مالا مال ہے۔

"یوتی الحکمتہ من یشاء ومن یوت الحکمتہ فقد اوتی خیرا کثیرا" (البقرہ۔ ۲۶۹)

اللہ ہی حکمت عطا کرتا ہے جسے چاہئے اور جسے حکمت دی گئی اسے خیرِ کثیر (یعنی) زیادہ بھلائی یا بھلائی کا زیادہ حصہ دیا گیا۔

اس لئے ہمیں جب کہ قلیل کا بھی علم نہیں ہے تو پھر کثیر کے بارے میں کیا رائے دی جا سکتی ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگی کا ایک بڑا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی شخصیت و کردار اور ان سے ظاہر ہونے والی کرامات کا ان کی اسی نسبت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یعنی

جن اولیائے کاملین کی نسبت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، نوح علیہ السلام یا اسی قبیل کی کسی اور بر گزیدہ ہستی سے ہو گی، ان سے اسی طرح کی کرامات کا بھی ظہور ہو گا۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کوئی بھی خلافِ عادت کیفیت جس کی نسبت حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نہ ہو گی، لامحالہ شیطانی فعل ہو گا، شیطان بھی تو گمراہی کا وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو ہدایت کے مشابہ ہو اور جس قدر یہ نسبت غالب ہو گی اس میں

"مدبر السموٰت والارض"

کی خصوصیت اور صفت بھی اسی تناسب سے غالب ہو گی۔ یہ کھلی حقیقت ہے کہ زمین و آسمان اور اس کے سوا جو کچھ بھی کائنات میں ہے اس کی تدبیر اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں۔ اس تدبیر کا اگر کوئی مظہر کامل ہو تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ ہی ہونا چاہئے۔

"اتممت علیکم نعمتی" (المائدۃ۔ ۳)

سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ حضور باباجیؒ کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر سرکار والا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مبارک نسبت کے اثرات بڑے غالب تھے۔ اس منطق کا تقاضا یہ بھی ہے کہ غالب کا اثر بقیہ پر تو ہو گا مگر غالب پر ضروری نہیں کہ دوسرا اثر بھی بیک وقت اثر انداز ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب جنّات والے لوگ حضور باباجیؒ کے پاس آتے تو ان کے جِن بھاگ جاتے، دستِ غیب والے لوگ آتے تو دستِ غیب بند ہو جاتا، موکلّات والے لوگ آتے تو موکلّات بھاگ جاتے، علم حساب والے لوگ آتے تو اس علم کے ذریعے جو روپہ پیسہ وہ کماتے وہ بند ہو جاتا، اسی طرح کشف والے لوگ آتے تو کشف بند ہو جاتا یا اس میں توازن پیدا ہو جاتا۔ مجذوب آپ کے پاس آتے تو وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آنا شروع ہو جاتے اور اس قبیل کی دوسری بے شمار باتیں اسی اثر سے متاثر ہوتیں۔

حضرت جنیدؒ شاہ صاحب سے کاکاجیؒ ہاؤس کی مسجد میں ہمارے بعض دوستوں نے دعا کے لئے درخواست کی تو مری روڈ کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے کہ اس سے اندر ہماری دعا کا اثر نہیں ہوتا۔ یہ سب اس تجلی اعظم کے پرتو کی وجہ سے ہی تھا جسے

"مدبر السمٰوات والارض"

کی صفت کہتے ہیں اور جو نسبتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وجہ سے حضرت باباجیؒ پر غالب تھی۔ میں نے دیکھا کہ بعض اوقات کئی ساتھیوں میں غیر معمولی ذوق وشوق و رغبت پیدا ہو جاتی تو حضور باباجیؒ صاحب ان کو پاس بلاتے اور ان کو کوئی چیز کھانے کو دیتے جس سے ان کا وہ ذوق وشوق ٹھنڈا ہو جاتا اور وہ سکون سے بیٹھ جاتے۔ خود میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا۔ اس وقت تو دلی قلق اور رنجش ہوتی تھی کہ ایسا کیوں ہوا۔ کیسی اچھی کیفیت تھی جو بدل گئی۔ اس وقت تو اس کی سمجھ نہیں تھی کہ اس کیفیت کا بدل جانا ہی کتنا ضروری تھا۔ اگر

"مدبر السمٰوات والارض"

کی اس صفت کی وجہ سے وہ کیفیات نہ بدلتیں تو پھر یقیناً توازن کا بگڑ جانا اور سارے نظام میں خلل پیدا ہو جانا صادق آتا۔ اسی بات کی طرف غالباً اشارہ ہے۔ اس واقعہ کا جس میں سرور انبیاء علیہ السلام نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھ دوسرے سوال کرنے والے اصحاب سے فرمایا:

"والذی نفسی بیدہ ان لوتداومون علی ما تکونون عندی وفی الذکر لصافحتم الملائکتہ علی فرشکم وفی طرقکم"

(رواہ الترمذی، ابن ماجہ و احمد)

ترجمہ۔ "وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر یہ کیفیت اس طرح ہمیشہ رہے جس طرح میرے ہاں اور ذکر کی حالت میں رہتی ہے تو ملائکہ آپ کے بستروں اور راستوں میں آپ سے مصافحہ کریں۔"

جس طرح "مدبر السمٰوات والارض"

کی یہ صفت غالب ہے عین اسی طرح اس کے حاملین کی تعداد بھی کم ہے۔ تصوف کی تاریخ سے بھی یہ پتہ چلتا ہے۔ ان معدودے چند حضرات میں حضرت غوث اعظمؒ یا اس درجے کے کچھ اور کاملین حضرات شامل ہیں۔ یہ حضرات جس تعداد میں کم ہیں اتنے ہی بڑے طاقت ور ہیں۔ اسی نسبت سے حضور باباجیؒ کی ولایت، معرفت اور کرامات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسی جامع شخصیت تھے۔

ایک شخص ۱۹۷۰ء میں مجھ سے ملنے آئے۔ کسی مجذوب کے ساتھ ان کی نشست

وبرخاست تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس مجذوب کے اثر سے وہ ایسی کیفیت میں مبتلا تھے کہ شاید وہ بھی ایک آدھ روز میں مجذوب ہو جاتے۔ میں نے ان کو کچھ کلمات پڑھنے کے لئے بتائے۔ یہ وہی کلمات تھے جو حضور باباجیؒ صاحب نے اس قسم کی کیفیت سے دوچار لوگوں کو میری موجودگی میں بتائے تھے۔ دوسری صبح جب وہ صاحب آئے تو ان کی کیفیت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اس طرح وہ مجذوب ہونے سے بچ گئے تھے۔ اس میں میرا کمال نہیں تھا بلکہ یہ اس نسبت کا اثر تھا جو حضور باباجیؒ صاحب کی مناسبت سے ہم نالائق لوگوں کو مشرف کرتی تھی۔

حضور باباجیؒ صاحب کی شخصیت کے بارے میں ایک اور نکتہ کی وضاحت میرے خیال میں ضروری ہے۔ یہ دلچسپ بحث ہے کہ معجزات کا وجود کیوں کر ہے اور اس کی ضرورت کیا ہے؟ یہ بحث اس لئے ایک موضوع ہے کہ جس طرح نبیوں کی پہچان عام طور پر ان کے معجزات سے ہی ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کی ذات معجزات کی محتاج نہیں ہوتی، اس طرح ولیوں کی پہچان کے لئے کسی خلافِ عادت غیر معمولی بات کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ تسلسل قائم رہے ورنہ درحقیقت کاملین کے نزدیک استقامت کو کرامت پر فوقیت حاصل ہے۔

(الاستقامہ فوق الکرامتہ)

جس کی وجہ یہ ہے کہ ظہورِ کرامت میں لذتِ نفس کا بھی پہلو ہے جب کہ استقامت میں خلوصِ کامل ہوتا ہے۔ اسی لئے اہل اللہ نے فرمایا۔

"نفسک الکرامتہ واللہ یطلب منک الاستقامتہ"

ترجمہ۔ یعنی تیرا نفس کرامت کا خواہش مند ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کو تجھ سے استقامت مطلوب ہے۔

کرامت کے بارے میں بات کرتے وقت یہ بات خیال میں رہنی چاہئے کہ کسی شخص میں کرامت کا موجود ہونا ایک بات ہے اور اس کا اظہار دوسری بات ہے۔ لامتناہی تجربات کے علاوہ کرامت کا وجود تو شاید قران کریم کی آیت سے بھی ثابت ہے۔

"ولقد کرمنا بنی ادم" (بنی اسرائیل۔ ۷۰)

ترجمہ۔ اور بے شک ہم نے اولاد آدمؑ کو عزت دی۔

یہ بحثیں کتابوں میں بے شمار ہیں۔ تاہم اتنی بات یقینی ہے کہ ہر صاحبِ کرامت

کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ولی ہو، لیکن ہر ولی لازماً صاحبِ کرامت ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی یقینی بات ہے کہ جس طرح کرامت کا اظہار بوجوہ ضروری ہے اسی طرح اس کا اپنا ایک قاعدہ اور ضابطہ بھی ضروری ہے۔ کائنات میں کوئی شے قاعدے اور ضابطے کی پابندی سے آزاد نہیں ہے۔ پھر یہی قاعدے اور ضابطے کرامات کے معیار کا بھی تعین کرتے ہیں۔ اور اس کو دوسری مشابہ کیفیات سے ممتاز بھی کرتے ہیں۔ کرامت کے بارے میں عوام کی خواہش اور معیار ایک بات ہے اور کرامت کے اپنے لوازمات دوسری۔ ان امور کو مثالوں سے ہی واضح کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے تو یہ مختصر تحریر نہیں بلکہ کسی ضخیم کتاب کی ضرورت ہو گی۔ تاہم اس بارے میں کتابوں میں جو کچھ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے وہ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ بقول حضور باباجیؒ ''اس سے زیادہ لکھنا جھوٹ ہے اور کم لکھنا خیانت ہے۔''

اس وقت جو بات میرے خیال میں ہے وہ حضور باباجیؒ کی شخصیت کی بعض خصوصیات کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار ہے۔ وہ اس لئے کہ میرے خیال میں ان کی شخصیت میں ایک خاص منفرد جامعیت اور انفرادیت تھی۔ اس کا ایک طریقہ تو یہی ہے کہ حضور باباجیؒ سے سرزد ہونے والے غیر معمولی واقعات کا حتی الامکان احاطہ کیا جائے جیسا کہ سالار صاحب نے یقیناً کیا ہے، اور پھر ہر ایک واقعہ کی گہرائی پر کچھ کہا جائے یا یہ کہ پڑھنے سننے والوں کی فکری صلاحیت پر چھوڑ دیا جائے مجھے خود حضور باباجیؒ صاحب کے ساتھ اس بارے میں جو تجربات ہوئے ہیں وہی اگر جمع کئے جائیں تو نہایت ہی اہم اور قابلِ قدر مواد میسر آ جاتا ہے لیکن وہ کام بھی اسی طرح نہایت ہی مشکل ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ حضور باباجیؒ صاحب کے بارے میں بعض دوسرے کاملینؒ نے جو کچھ فرمایا اور جس کا مجھے علم ہے اس کو قلمبند کیا جائے۔

اولیائے کاملینؒ کے بارے میں صحیح رائے تو اصل میں وہی ہے جو اہلِ معرفت قائم کر سکتے ہیں۔ جب کہ ان کے ماننے والے بالعموم غلو کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اس میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے حضور باباجیؒ صاحب کے بارے میں کچھ کہا ہے ان کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کس درجے کے لوگ تھے۔ محدثین نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کو قلمبند کرنے کے لئے سب سے پہلے راوی حضرات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بڑی طویل اور صبر آزما مشق

کی تھی اور ان کی زندگی کا ایک ایک گوشہ چھان مارا تھا۔ یہاں یہ طریقہ اختیار کرنا یقیناً مشکل کام ہے بلکہ ناممکن۔ البتہ وہ حضرات جن کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ یہ حضرات صاحب کمال و معرفت تھے تو انہوں نے باباجیؒ صاحب کے بارے میں جو کچھ کہا اسی پر اکتفاء کیا جائے۔

چنانچہ اپنے بعض تجربات کے علاوہ زیادہ مناسب یہی ہے کہ میں نے ان مبارک حضرات سے جو چند باتیں وقتاً فوقتاً سنیں یا انہوں نے براہ راست مجھے مخاطب کر کے کہیں ان میں سے جو مجھے اچھی طرح یاد ہیں، ان کا ذکر اختصار سے کروں۔ بعض ایسی باتیں بھی ہیں جو حضور باباجیؒ صاحب کے اور میرے درمیان گزریں۔ مگر ان کا ذکر مناسب ہے نہ کیا جا سکتا ہے۔

جن کاملین میں بیٹھنے اور اس طرح ان کی صحبت کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے ان میں ایک بزرگ سواجال (سرجال) والے باباجیؒ تھے۔ ان کا وصال حضور باباجیؒ صاحب کے وصال سے کوئی دس سال بعد ۱۹۶۴ء میں ہوا تھا۔ سواجال والے باباجیؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگلوں اور بیابانوں میں گزرا۔ وہ حضور باباجیؒ کو "فقیر صاحب" کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کے مرتبے کا اندازہ ان کے حالات کے علاوہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے زندگی میں سوا لاکھ اولیاء اللہ کو دیکھا ہے۔ ایک دفعہ وضو کر رہے تھے اور میں پانی ڈال رہا تھا۔ فرمانے لگے۔

"پتہ نہیں ہمارا کیا ہو گا"؟

اس پر میں نے رنجیدہ ہو کر کہا اگر یہ معلوم نہیں کہ آپ کا کیا ہو گا تو پھر ہمارا کیا بنے گا۔ اچانک ان کی طبیعت سنجیدہ ہو گئی، کہنے لگے:

"نہیں نہیں ایسی بات مت کہیں، فقیر صاحب کے ملنے والے لوگوں جیسا کسی کو اللہ تعالیٰ کر دیں تو اس کو اور کیا چاہئے۔"

ایک دوسرے موقع پر انہوں نے مجھے پڑھنے کے لئے کچھ کلمات بتائے۔ میں نے کہا یہ کلمات حضور باباجیؒ صاحب نے کسی اور طریقہ سے پڑھنے کے لئے مجھے بتائے ہیں۔ یہ سن کر وہ کچھ دیر چپ رہے، پھر کہنے لگے، "دیکھو! ان کی بات نہ تو آپ سمجھ سکتے ہیں، نہ میں سمجھ سکتا ہوں"۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر کہنے لگے، "اور نہ ہی دنیا

میں اس وقت کوئی اور موجود ہے جو سمجھ سکتا ہو۔ " پھر کہنے لگے۔ "نہ ہی آئندہ کوئی اتنی تکلیف برداشت کرے گا کہ ان کی بات کو سمجھ سکے۔ " تصوف میں تکالیف اور مصائب کا برداشت کرنا اگرچہ بذاتہ ایک اہم موضوع ہے لیکن خاص طور پر حضور باباجیؒ صاحب کے بارے میں ان کی کیا رائے تھی۔ اب یہ متعین کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ خود کس درجہ میں اور کس مقام پر فائز تھے۔ تاہم جو باتیں میں نے سرجال والے پیر صاحب کے پاس بیٹھ کر دیکھیں یا سنیں اور تصوف کے بارے میں جو میرا تھوڑا بہت کتابی یا تجرباتی علم ہے یا دوسرے تجربات اور مشاہدات ہیں ان کی بنیاد پر ایسا لگتا ہے کہ حضور باباجیؒ صاحب نہ صرف اپنے وقت کی ایک منفرد شخصیت تھے بلکہ گمان یہ بھی ہوتا ہے کہ باباجیؒ صاحب کا زمانہ خدا جانے کتنی صدیوں پر محیط تھا۔ گویا وہ گنتی کے ان چند حضرات میں سے ہوں گے جنکا زمانہ صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ اس کا ذکر بھی سالار صاحب نے حضرت کاکاجیؒ صاحب کی زبانی کیا ہے۔

حضور باباجیؒ صاحب کے ایک مرید "نمب والے مولوی صاحب" کے نام سے مشہور ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ حضور باباجیؒ صاحب سے کہا کہ: دوسرے بزرگانِ دین کے مرید جب آپ کو ملنے آتے ہیں تو آپ ان کی بہت خاطر تواضع کرتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ اگر کسی کے پاس جائیں تو ان لوگوں کے ہاں ہماری اس طرح پذیرائی نہیں ہوتی۔ " حضور باباجیؒ صاحب نے فرمایا " آپ کسی آنکھ والے کے پاس جا کر دیکھیں " ۔ اس اثناء میں مولوی صاحب کو حضور باباجیؒ صاحب نے کسی کام سے کوہالہ کے قریب ایک مجذوب کے ہاں بھیجا۔ انہوں (کوہالہ والے مجذوب) نے بہت غیر معمولی طور پر مولوی صاحب کی آؤ بھگت کی۔ کہنے لگے چائے کے لئے دودھ نہیں ہے۔ معلوم نہیں بکریوں والے کدھر چلے گئے ہیں۔ انہوں نے مولوی صاحب کو کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ آپ یہاں سے جا کر چائے پی لیں۔ مولوی صاحب واپس روانہ ہوئے تو مجذوب انہیں الوداع کرنے باہر آئے تو اس وقت تک وہیں کھڑے رہے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔ کوہالہ والے مجذوب صاحب کے بارے میں حضور باباجیؒ صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اگر وہ ایک بار بھی زبان سے کہہ دیں تو کشمیر آزاد ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کمال درجے کے فقیر تھے اور ان کے ہاں مولوی صاحب کی نسبت کا کتنا احترام و پاس ادب تھا۔ کچھ لوگ یہ سوال کر سکتے ہیں

کہ اگر وہ مجذوب اس درجے پر فائز تھے کہ ان کے کہنے سے کشمیر آزاد ہو جاتا تو پھر انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ خود باباجیؒ صاحب جو ان مجذوب صاحب سے بھی یقیناً بلند درجے پر فائز تھے۔ انہوں نے خود ایسا کیوں نہیں کہا۔ ان سوالات کا جواب سمجھا تو جا سکتا ہے مگر شاید بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کا اہل خود بیان کرے تب تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ البتہ مجھے اس میں نہ کوئی شک ہے نہ اشکال۔

اس طرح راولپنڈی میں سائیں منہاں نام کے ایک اور مجذوب تھے۔ ہمارے ایک دوست نے انہیں بہلا پھسلا کر ایک مرتبہ تانگے پر بٹھایا اور اس جگہ لے آئے جہاں حضور باباجیؒ صاحب رہتے تھے۔ جوں ہی وہ تانگے سے اترے انہوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی یہ کہتے جاتے تھے کہ:

"غوث ہے ..... غوث ہے ....."

یہ بات جب حضور باباجیؒ صاحب کے علم میں آئی تو حضور باباجیؒ صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ "وہ بے ہوشی کے عالم میں یہاں آ گئے ہوں گے ورنہ ان کا یہاں کیا کام ہے۔" یہ جملے بھی اتنے جامع اور پر معنی ہیں کہ ان پر بھی پورا تحقیقی مضمون لکھا جائے تب شاید کچھ سمجھ میں آ سکے۔ سائیں منہاں صاحب کو اگر یہ کشف ہوا کہ حضور باباجیؒ صاحبِ غوث ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ غوثیت سے بڑے کسی درجہ پر فائز نہ تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مقام غوثیت کوئی کھیل تماشا ہے۔ ممکن ہے کہ حضور باباجیؒ صاحب کا مقام اس سے بھی بلند تر ہو بلکہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سائیں منہاں صاحب کی اپنی بصیرت شاید اتنی ہی تھی کہ وہ اس مقام سے آگے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ امر بھی کاملین کے حالات میں مشاہدہ میں آتا رہا ہے۔

حضور باباجیؒ صاحب کے حالاتِ زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے اعلیٰ وارفع اور بلند مقامات پر فائز تھے جو غوثیت سے بھی بہت بلند ہو گا۔ پھر اس میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ جب تک کوئی شخص خود اس مقام سے واقف نہ ہو اس کے بارے میں کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔

جنید شاہؒ صاحب کے متعلق کچھ معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کی شخصیت کیسی تھی۔ جن دنوں جنید شاہؒ صاحب حضور باباجیؒ صاحب کے ہاں رہتے تھے ان دنوں حضور باباجیؒ

صاحب سے ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں جیسے شاہ صاحب تو خضری ولی ہیں۔ یہ یہاں آپ کے پاس کیسے آتے ہیں (کسی نے تعجب کا اظہار کیا) یہ سن کر آپ کی طبیعت مبارک میں تھوڑی سی جلالت آ گئی۔ فرمانے لگے جن کو لوگ خضر کہتے ہیں ان کو بھی کچھ عرصہ ہمارے پاس رہنا پڑا ہے۔ بلاشبہ یہ باتیں انسانی عقل اور سوچ سے ماوراء ہیں، مگر حقیقت میں سچ ہیں۔ باباجیؒ صاحب کی بعض باتیں واضح طور پر ایسی تھیں جو خضری ولایت کی واضح نشاندہی کرتی تھیں۔

پہاڑ میں باباجی الف دینؒ کا نام مشہور ہے۔ اس سلسلہ عالیہ میں سات پشتوں سے خضری ولی پیدا ہوتے رہے ہیں اور اس کا بھی ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ تاہم اس سلسلہ کے بزرگوں سے ملاقات کا ایک واقعہ ذکر کرتے ہوئے حضور باباجیؒ نے ایک مرتبہ فرمایا:

"میں کاغان گیا۔ جب میں کاغان کی حدود میں داخل ہوا تو دو بڑے طاقت ور آدمی میرے منتظر تھے۔ انہوں نے پٹوؤں کے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پختہ عمر کے تھے۔ ان کی شکلیں بھی ایک جیسی تھیں۔ انہوں نے میرا نام لے کر پوچھا کہ آپ فلاں شخص ہیں۔ میں نے کہا ہاں! تو انہوں نے کہا کہ ہمیں حکم ہے کہ ہم آپ کو کندھوں پر اٹھا کر باباجیؒ کے پاس لے جائیں۔"

میں نے ان سے کہا کہ میں تو جوان اور تندرست آدمی ہوں، آسانی سے چل سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ان کے لئے باباجی الف دینؒ کا حکم یہی ہے۔ آپ کو اٹھا کر لے جانا ہے۔" چنانچہ وہ مجھے اٹھا کر باباجی الف دینؒ صاحب کے پاس لے گئے۔ باباجی الف دینؒ ایک غار میں رہتے تھے۔ باباجیؒ فرماتے ہیں کہ وہ چار پشتوں کے لوگ اکٹھے بیٹھے تھے۔ ایک جیسے قدوقامت، خوبصورت چہرے، گرم کپڑے اور ہاتھ میں تسبیحیں۔ کہنے لگے ہم ابھی وہاں بیٹھے ہی تھے کہ بکری کا ایک بچہ وہاں پر آ نکلا اور پیشاب کرنے لگا۔ پیشاب کے چھینٹے ان پر آ پڑے۔ باباجی الف دینؒ نے گوجری زبان میں کہا کہ "تم پر بجلی گرے"۔ باباجیؒ فرماتے ہیں کہ

جوں ہی ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے، بجلی گری اور بکری کے بچے کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ہمارے باباجیؒ صاحب نے ان سے کہا کہ یہ تو جانور ہے، اس کو کیا معلوم تھا کہ یہاں کون بیٹھا ہے۔ باباجی الف دینؒ فرمانے لگے "کاکا آپ کا بڑا حوصلہ ہے۔"

باباجی الف دینؒ نے حضور باباجیؒ صاحب کو دوستی کی علامت کے طور پر اپنی داڑھی سے ایک بال نکال کر دیا۔ ایک دن حضور باباجیؒ صاحب نے دیکھا کہ وہ بال گم ہو گیا تھا۔ آپؒ نے فرمایا کہ باباجی الف دینؒ شاید وصال کر گئے ہیں۔ اس سے تھوڑی دیر بعد پیغام ملا کہ وہ واقعی وصال فرما گئے تھے۔ حضور باباجیؒ صاحب جب تک زندہ رہے باباجی الف دینؒ کی جانب سے ہر سال دو آدمی ایک بڑا قد آور بکرا لے کر حضور باباجیؒ صاحب کے پاس آتے۔ خضری ولیوں کے ساتھ حضور باباجیؒ کے تجربات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات خود حضور باباجیؒ صاحب کی کس قدر عزت کرتے تھے حالانکہ یہ ایسے جلیل القدر لوگ تھے کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ تقدیر بن جاتا تھا۔ باباجی الف دینؒ کے خانوادے کے ساتھ تعلقات کے بارے میں متعدد اور واقعات بھی ہیں لیکن اس وقت یہی کافی ہے۔

کہتے ہیں کہ حضور باباجیؒ صاحب بڑے خوش الحان تھے۔ حضور بکوٹیؒ کی ایک مجلس میں آپؒ بھی چلے گئے۔ حضرت بکوٹیؒ نے فرمایا۔ آپ میں سے (حاضرین مجلس سے) کوئی مولانا رومؒ کی کوئی غزل یا شعر سنا سکتا ہے۔ حضور باباجیؒ صاحب کہتے ہیں مجھے بہت ذوق وشوق تھا لیکن میں چپ رہا۔ جب دوسری تیسری بار انہوں نے یہی الفاظ دہرائے تو میں نے ترنم سے مثنوی مولانا رومؒ کے کچھ اشعار پڑھے۔ اشعار سن کر حضرت بکوٹیؒ وجد میں آ گئے۔ اسی حالت میں فرمانے لگے مانگو کیا مانگتے ہو؟ باباجیؒ فرماتے ہیں "میں چپ رہا" حتیٰ کہ تین دفعہ انہوں نے پوچھا، تب بھی میں چپ رہا۔ جب آپؒ کا وجد ختم ہوا تو حضرت بکوٹیؒ نے فرمایا کہ میں نے آپ سے کچھ پوچھا تو نہیں تھا؟ حضور باباجیؒ نے فرمایا کہ ہاں آپ نے پوچھا تھا کہ جو مانگنا ہو مانگ لو۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ نے کچھ مانگا کیوں نہیں؟ تو حضور باباجیؒ صاحب نے فرمایا "جو کچھ ہمارے لئے مفید ہے وہ آپ پر واضح ہے۔ جو غیر مفید ہے اس کا مطالبہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" کہتے ہیں کہ اس پر وہ وجد

میں آ گئے اور مجھے سینے سے لگا لیا اور فرمایا:

"جائیں اللہ تعالیٰ آپ کو (اپنا نام لے کر) مجھ سے کم نہیں کرے گا۔" جو حضرات حضرت بکوئیؒ کے بلند مرتبہ سے کچھ آشنا ہیں وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کا کیا مفہوم ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی عظمت کا ایک اور بڑا نمایاں پہلو عفوودرگذر ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے۔

ولمن صبر و غفر ان ذلک لمن عزم الامور
(الشوریٰ: ۴۳)

ترجمہ: "اور جس نے صبر کیا اور بخش دیا وہ ہمت کے کام ہیں۔"

نبی علیہ الصلوٰۃ وَالسّلام بلاشبہ خدائے تعالیٰ کے اس فرمان کے مظہرِ اُتم تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد بھی قابل توجہ ہے۔

"ولو انهم اذظلموا انفسهم جائوک
فاستغفروالله واستغفرلهم الرسول
لوجدوالله توابا رحيما"
(النساء: ۶۴)

ترجمہ۔ اگر وہ آپ کے پاس آئیں اپنے نفسوں پر ظلم کر کے پس اللہ تعالیٰ سے بخشش چاہئیں اور (آپؐ) رسول اللہ بھی ان کے لئے معافی مانگیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو معاف کرنے والا نہایت مہربان پائیں گے۔

اس آیت پر ذرا غور کریں کہ کیسی عجیب بات پروردگار نے فرمائی ہے۔ ظلم میں ہر قسم کی نافرمانی شامل ہے حتیٰ کہ یہ لوگ کفر بھی کرتے ہوں گے اور حضورؐ اگر ان کی معافی کے لئے درخواست کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرنے والے ہیں۔ یہ بات تمام انبیاء علیہم السلام میں نبی علیہ السلام کی فضیلت کو ممتاز کرتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس پر بھی استدلال کیا ہے کہ یہ فضیلت حضور صلی اللہ علیہ وَسلّم کی زندگی تک ہی نہیں تھی بلکہ قیامت تک رہے گی۔ آج بھی جو لوگ آپؐ کے روضہ مبارک پر چلے جائیں گے اور معافی کی درخواست کریں گے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی معافی کی درخواست کی تو ان کو معاف کر دیا جائے گا۔ روضۂ اطہر پر جانا اگرچہ ایک ظاہری شرط دکھائی دیتی ہے

مگر وہ ہماری اپنی عقلی تاویل ہے چنانچہ جو شخص اولیاء اللہ میں محمدی مشرب سے تعلق رکھنے والا ہو گا ان کو اپنے درجے میں اس صفت کا بھی حصہ عطا ہونا چاہئے۔ میں جب حضور باباجیؒ صاحب کی زندگی مبارک پر نگاہ ڈالتا ہوں تو کئی واقعات مجھے ایک ایک کر کے یاد آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور باباجیؒ صاحب اگر اس مشرب کے ولی نہ ہوتے تو صورت بالکل مختلف ہوتی کیونکہ دوسرے مشارب کے لوگوں نے ایسے بعض معاملات میں بہت سختی کی ہے اور کرامت کا استعمال دوسرے طریقہ سے کیا ہے جیسے کئی دوسرے انبیاء علیہم السلام نے کیا جب کہ حضور پرنورؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا:

"میں نے اپنی دعا کو قیامت تک اُمّت کے لئے محفوظ رکھا ہے جب کہ میرے دوسرے بھائیوں نے یہ دعا کر کے اس کو ضائع کر دیا ہے۔"

بعض مسالک کے اولیاء نے چھوٹی چھوٹی باتوں پر مریدوں اور خادموں پر گرفت کی۔ جب کہ حضور باباجیؒ صاحب کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف خطاکاروں پر کوئی گرفت نہ کی بلکہ ان کا پردہ رکھا تاکہ وہ رسوا نہ ہوں اور ان کے ساتھ شفقت سے پیش آئے۔ انہوں نے ان لوگوں کا ایسے طریقے سے علاج کیا کہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو گیا۔ یعنی لوگوں کی اصلاح بھی ہو گئی اور کسی کو معلوم بھی نہ ہوا۔ میں خود جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے کوئی واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ اس کے ابتدائی کلمات سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ باباجیؒ صاحب میرے پردے کی باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ جب کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا پردہ رکھتے ہیں تو اگر کوئی اللہ کا ولی ہو تو اسے کیا حق ہے کہ وہ مخلوق کا پردہ فاش کرے۔ یہ خیال آتے ہی وہ مسکرائے اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "ہم کسی کا پردہ فاش نہیں کرتے"۔ اس کے بعد کبھی بھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ میرے پردے کی باتیں بیان کریں گے۔ اس نقطہ کی وضاحت کے لئے میں حضور صلی اللہ علیہٖ وآلہٖ وسلّم کے دو واقعات گزارش کروں گا۔

سفرِ حج کے دوران ایک صحابی کا چہرہ ایک خاتون کی طرف اٹھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیار سے اپنے دستِ مبارک کے ذریعے (ان اصحابی کا چہرہ) دوسری طرف پھیر دیا۔ رحمتہ اللعالمین کی شفقت کا اندازہ کیجئے کہ بجائے اس کے کہ آپؐ ان پر ناراض ہوتے آپؐ نے پیار سے ان کا چہرہ اپنے دست مبارک سے دوسری طرف پھیر دیا

تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا یا رسول اللہ مجھ سے "فلاں جرم" سرزد ہو گیا ہے۔ آپ نے پوچھا تم نے نماز میرے پیچھے نہیں پڑھی، اس نے کہا نماز تو پڑھی ہے۔ مطلب یہ تھا جب تم نے میری اقتداء میں نماز پڑھی ہے تو اس کی تلافی ہو گئی ہے۔ اس صفت کا پرتو حضور باباجیؒ صاحب میں بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ ایسی ہی خطائیں کر کے حضور باباجیؒ صاحب کے پاس آجاتے مگر آپ خوش اخلاقی سے ان کے ساتھ پیش آتے اور انہیں احساس تک نہ ہونے دیتے۔ اگرچہ ان میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہوتے تھے جن سے ملنے کے بعد حضور باباجیؒ صاحب غسل کر کے نماز پڑھتے تھے۔ حتیٰ کہ ان سب کی اصلاح ہو گئی۔ ایک ایک کر کے جوں جوں ان کی موت کا وقت قریب آتا ان کی اصلاح ہوتی گئی۔ ان میں سے کوئی تہجد پڑھتے ہوئے، کوئی نفل ادا کرتے ہوئے اور کوئی عبادت کرتے ہوئے خدا کے حضور حاضر ہو گیا۔ یہ صفت حضور باباجیؒ صاحب میں بڑے کمال درجہ پر تھی۔ حضور باباجیؒ صاحب چونکہ بڑے اعلیٰ مشرب سے فیضیاب تھے اس لئے ان کو اس میں بڑا کمال حاصل تھا۔ ان کی عظمت کو ماپنے کا یہ بھی ایک معیار ہے ایک دفعہ ایک عمر رسیدہ شخص حضور باباجیؒ کے پاس آیا۔ پیری مریدی کرتا تھا۔ کہنے لگا میں نے علیحدگی (تنہائی) میں بات کرنی ہے۔ سب لوگ اٹھ گئے ایک نوجوان جو حضور باباجیؒ صاحب کی خدمت کرتا تھا بیٹھا رہا۔

اس شخص نے اپنی مشکل بیان کی کہ وہ کسی خاتون کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ عمر میں فرق کی وجہ سے شادی میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس لئے مدد کا طلب گار تھا۔ حضور باباجیؒ صاحب نے اس کو کچھ کلمات بتائے کہ احرام باندھ کر چالیس دن تک پڑھے۔ اس شخص نے کہا کہ میں چالیس دن اس خاتون کے ہجر میں نہیں رہ سکتا۔ حضور باباجیؒ صاحب نے فرمایا تم شروع کرو اللہ تعالیٰ کوئی سبب کر دیں گے۔ جب وہ بزرگ چلا گیا تو حضور باباجیؒ صاحب نے خدمت گار سے مخاطب ہو کر فرمایا میں دیکھتا ہوں کہ ان کی روح پرواز کر گئی ہے اور یہ کس بکھیڑے میں پڑا ہے۔ اس واقعہ کے ساتویں یا آٹھویں روز اعتکاف کی حالت میں احرام باندھے ہوئے وہ شخص فوت ہو گیا۔ اب دیکھیں کہ حضور باباجیؒ صاحب نے اس کی ملامت کرنے یا ناراض ہونے کی بجائے حکمت سے اس کی

راہنمائی کی۔ اس طرح کہ اس کی عاقبت سنور گئی (یہ واقعہ اس خدمت گار نے بیان کیا جو باباجیؒ صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا)۔

ایسے اور بھی بے شمار واقعات ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ حضور باباجیؒ صاحب سے نسبت رکھنے والے یا ان سے ملنے والے اکثروبیشتر لوگ ایسے ہیں جن سے نہ صرف ادنیٰ کوتاہی سرزد ہوئی بلکہ بہت سنگین غلطیاں سرزد ہوتی رہیں لیکن حضور باباجیؒ صاحب نے ملامت کرنے یا رد کرنے کے بجائے اس کا ازالہ بڑے حکیمانہ انداز سے پیار اور محبت کے ساتھ کر دیا۔ بلاشبہ اس اعتبار سے بھی آپ اپنے دور کی ایک منفرد شخصیت تھے۔ بزرگانِ دین کی عظمت کے بارے میں ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ ان کے حلقہ ارادت میں لوگوں کی تعداد بھی یقیناً اسی نسبت سے ہونی چاہئے یا یہ کہ جس کے ماننے والے جتنے زیادہ ہوں گے وہ اتنا ہی بڑا ولی اور صاحب کرامت ہو گا۔ یہ اصول کسی حد تک درست بھی ہے۔ مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ کائنات کے نظام کو اپنی عقل پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ نظام میں تو یہ بھی ہونا چاہئے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہوں جن کو نہ صرف عوام بہت کم جانتے ہوں یا جانتے ہی نہ ہوں بلکہ خواص بھی ان کے محتاج ہوں۔ چنانچہ تصوف کے طالب جانتے ہیں کہ ایسے حضرات کی بھی اس سلسلہ میں کمی نہیں رہی۔

ہمارے ہاں حضور باباجیؒ صاحب کی خدمت میں ایک ایم ایس سی (ایگریکلچر) آیا کرتے تھے۔ ایم ایس سی ہونے کے علاوہ وہ علمی شخصیت اور سوچ و فکر کرنے والے شخص تھے۔ وہ کئی لوگوں کو ایک بات کہتے تھے۔ انہوں نے جو مجھ سے بھی کہی، کہنے لگے:

> "آپ ادھر کیا کر رہے ہیں۔ کیوں وقت ضائع کرتے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر صرف ڈگری عطا کرتا ہے، پڑھاتا نہیں۔ الف با تا پڑھنا ہو تو پرائمری کے استاد کے پاس جانا چاہئے نہ کہ وائس چانسلر کے پاس۔ باباجیؒ صاحب تو وائس چانسلر ہیں۔ آپ لوگ کیوں اپنا اور ان کا وقت ضائع کرتے ہیں۔"

اس بحث میں نہیں پڑتے کہ وہ درست کہہ رہے تھے یا نہیں۔ مگر جب ان لوگوں پر نظر ڈالی جائے جن پر حضور باباجیؒ صاحب کی نگاہِ کرم رہی تو ایک بات بہت نمایاں

معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ اکثر بزرگانِ دین کے ہاں جو لوگ دکھائی دیتے ہیں وہ تقریباً سب ہی پہلے سے ہی شریف النفس ہوتے ہیں۔ جب کہ حضور باباجیؒ صاحب کے ہاں جس شخص کو دیکھو اپنی علیحدہ دنیا کا مالک دکھائی دیتا ہے اور ان کے زیادہ قریب ہو جانے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے نفس انتہائی باغی ہیں۔ اگر یہ لوگ حضرت باباجیؒ صاحب کی خدمت میں نہ آتے تو یقیناً اپنے گردونواح میں زبردست فساد پیدا کرتے۔ یہ فساد کی قوت کسی بدبختی کی علامت نہیں ہوتی بلکہ ہر بلندی کے ساتھ اسی قدر پستی کے وجود کی علامت ہوتی ہے لیکن ہوتا یہی ہے اور یہ بات غالباً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے مشتق ہے کہ:

"خیارکم فی الجاھیلتہ خیارکم فی الاسلام"

ترجمہ۔ دور جاہلیت کے تمہارے بہترین لوگ اسلام میں بہترین ہیں۔

لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات جو جاہلیت میں بہتر تھے کسی معمولی طریقہ سے حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے حتیٰ کہ حضور والا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان میں سے بعض کے لئے دعا کرنا پڑی۔

"یا اللہ فلاں یا فلاں کو مسلمان کر دے۔"

میں جب خود اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر کا واثق یقین ہو جاتا ہے کہ اگر میں حضور باباجیؒ صاحب کی خدمت میں نہ آیا ہوتا تو نہ صرف خود گمراہ ہوتا بلکہ اپنے گردونواح میں گمراہی پھیلا دیتا۔ گمراہ کن خیالات ہر وقت دل ودماغ میں چکر لگاتے تھے اور ان کا کوئی حتمی علمی جواب نہیں ملتا تھا جو لوگ کمزور دل ودماغ اور کم علم والے مجھ سے یہ باتیں سنتے تھے وہ بھی شک میں پڑ جاتے تھے۔ میرا اب بھی خیال ہے کہ علمی اعتبار سے ان سب سوالات کا تسلی بخش جواب نہیں ہے اور اگر ہو تب بھی نیت اندر سے شیطان ہو تو تسلی نہیں ہوتی، اور یہی وہ مقام ہے جہاں بغیر کسی تدبیر کے مردِ حق آگاہ کی نگاہ وصحبت سے اس قسم کے مسائل حل ہو جاتے ہیں ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مجھے قریب سے جاننے والے جانتے ہیں کہ میری سیاست میں اخلاقی قدریں ہمیشہ غالب رہی ہیں۔ سیاست میں یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔ اپنے دور کے سیاست دانوں

میں یہ بات بہت کم دیکھتا ہوں۔ میں نے کئی اچھے سے اچھے سیاست دان دیکھے ہیں جو نماز روزہ کے بھی عادی ہیں۔ مگر یہ لوگ سیاست میں اخلاقی قدروں پر یقین نہیں رکھتے۔ میرے لئے ان قدروں کو قائم رکھنے کا بنیادی سبب حضور باباجیؒ صاحب کی خاص توجہ اور مہربانی ہے اور ان کی وجہ سے میرا یقین قضاوقدر پر بھی بہت مضبوط ہے۔ ایک مرتبہ سیاست کے کسی واقعہ کے حوالے سے میں نے حضور باباجیؒ صاحب سے کہا کہ حالات اس طرح ہیں۔ آپؒ کی طبیعت مبارک میں جلال آ گیا اور آپ نے فرمایا کہ:

"حالات آپ کے تابع ہیں۔ آپ حالات کے تابع نہیں ہیں۔"

بقول علامہ اقبالؒ ؎

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ گر تو نسازد تو با زمانہ ستیز

یعنی یہ بے خبر لوگ کہتے ہیں کہ تو حالات کے تابع ہو جا، تو حالات کے تابع ہو جانے کے بجائے ان سے نبرد آزما ہو کر انہیں اپنے تابع کر لے۔ اور اگر میرے ذاتی معاملات درست ہوں تو عملاً یہی ہوتا ہے جب خرابی ہو جاتی ہے تو پھر حالات بھی قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ حضرت باباجیؒ کے ارشادات کا ہی اثر ہے ورنہ یہ عقیدے کی بات ہے جو آپ نے فرمائی۔ ان کا قول علامہ مرحوم کے اس شعر کے مصداق ہے کہ ؎

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سیاست کرنا میرا شوق نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا ذوق ضرور رکھتا ہوں لیکن یہ بڑا عجیب معاملہ ہے کہ میں سیاست چھوڑ نہیں سکتا۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے جبراً کسی نے پکڑ رکھا ہے۔ اگر ساری زمین کی حکومت میرے پاس ہو تو اس سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ مجھے تو زندگی میں کئی بار ایسے لمحات دیکھنے اور محسوس کرنے کی سعادت حاصل ہے کہ اس کے ہر لمحہ پر پوری کائنات کی حکومت کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ قیامت کے دن اس کی بڑی مشکل جوابدہی ہے۔ ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں میری مدد اور رہنمائی کرے۔ حضور باباجیؒ صاحب کے پاس بیٹھا تھا تو وہ کبھی کبھی ایک مصرع پڑھتے تھے ؎

غم ہم کو دیا جو سب سے مشکل نظر آیا

اس وقت اس مصرعے کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا بات کہہ رہے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر انہوں نے فرمایا:

"ہم چاہتے ہیں دونوں باتیں ہوں"

سچی بات یہ ہے کہ حضور باباجیؒ صاحب کا کمال تھا کہ میں زندگی میں متضاد کشتیوں پر چل کر بھی سلامت رہا۔ زندگی کے نشیب وفراز میں کئی قسم کی مشکلات اور مصائب سے گزرا ہوں لیکن ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ حضور باباجیؒ صاحب میرے قریب ہیں۔ چنانچہ میں جب اپنے "پیر بھائیوں" کے نجی حالات کے بارے میں دیکھتا اور سنتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہر شخص ایک جنّ ہے جو کوزے میں بند کیا گیا ہے اور اسی سے میں حضور باباجیؒ صاحب کی عظمت کا اندازہ کرتا ہوں۔

حضور باباجیؒ صاحب کی زندگی کے ہر واقعہ اور ان کے ہر عمل یا گفتگو میں تصوّف کا کوئی نہ کوئی باریک نقطہ پوشیدہ ہوتا تھا۔ یہ بھی دراصل کمال ولایت ہے۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر بعض اوقات جو براہِ راست مجھے یا کچھ دوسرے لوگوں کو پیش آئے ان کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کرتا ہوں۔ ان واقعات سے بھی حضور باباجیؒ صاحب کی شخصیت کے بارے میں کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ واقعہ جس کا میں ابھی ذکر کر رہا ہوں حضور باباجیؒ صاحب سے ملنے والے معتبر لوگوں سے سنا ہے۔ ایک شخص حضور باباجیؒ صاحب کے پاس آیا۔ اس نے کسی روحانی مرتبے کی خواہش کی۔ ہو سکتا ہے اس نے محض اضطراری طور پر بات کی ہو تاہم حضور باباجیؒ صاحب نے فرمایا: "وہ چیز آپ کے مقدّر میں نہیں ہے۔" وہ شخص بڑا سمجھدار تھا۔ شاید اس کا مقدّر ہی ایسا ہوا ہو۔ اس نے کہا کہ اگر میرے مقدّر میں ہوتی تو میں آپ کے پاس کیوں آتا۔ کہتے ہیں حضور باباجیؒ صاحب نے اسے فرمایا: "جو چیز تمہارے مقدّر میں نہیں، اس کے لئے حق پیدا کرنا چاہتے ہو۔ تو چالیس دن تک اعتکاف کی شکل میں کلمہ شریف پڑھو۔" اس نے کہا! میں نے بہت کوشش کر کے دیکھی ہے، مجھ سے اب اتنی محنت نہیں ہو سکتی۔ آپ نے فرمایا: "بیس دن پڑھو۔" اس نے کہا، بیس دن بھی نہیں پڑھ سکتا۔ آپؒ نے کہا "تین دن پڑھو۔" اس نے کہا کہ تین دن بھی نہیں پڑھ سکتا۔ اس پر حضور باباجیؒ صاحب نے کمال شفقت سے اپنے ہاتھ پر کچھ لکھا اور اس شخص

کو کہا "اس کو دیکھو"۔ کہتے ہیں کہ جونہی اس کی نظر اس پر پڑی اس کی دنیا ہی بدل گئی اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔ جیسے حضرت حافظؒ نے فرمایا ہے۔ "جس کو خبر ہو گئی پھر اس کی خبر نہیں ملی۔" تو بات یہ ہے کہ اگرچہ وہ چیز اس کے اپنے مقدر میں اصلاً نہیں تھی، لیکن ایک ولی کامل کے ساتھ اس کے لئے وہ بات مشروط تھی، اسی لئے وہ ہو گئی۔ اس خالقِ کون ومکان کی دوستی اگر کسی کو میسر ہو تو اس کے لئے یہ بھی بہت ادنیٰ بات ہے۔

اس قسم کا ایک واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ان کا واسطہ بھی ایک ایسے فقیر سے پڑا تھا جس نے اپنے جسم کے ہر حصہ سے گوشت کاٹ کر خدا کے نام پر خوشی خوشی دے دیا تھا۔ خدا سے عشق کرنے والے ایسے لوگوں کی بات اللہ تعالیٰ رد نہیں کرتے۔ البتہ ان کا اپنا ایک نظم اور ضابطہ ہے۔ جس کی وجہ سے یہ باتیں نہ تو عام ہیں نہ روزمرہ کا معمول۔ ایسے فقیر کی دعا پر اگر اللہ تعالیٰ کسی بے اولاد عورت کو اولاد دے دے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ بلکہ حیرت تو اس پر ہونا چاہئے کہ اللہ کے عاشق اور غیر عاشق میں کوئی فرق نہ ہو، ہم تو اپنے ساتھ محبت اور عشق کرنے والوں کی بات نہیں رد کرتے۔ فرق اتنا ہے کہ ہم اتنا ہی دیتے ہیں جتنا ہمارے پاس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس کسی چیز کی نہ تو کمی ہے اور نہ کوئی حد ہے۔ عقل بھی یہی کہتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خدا سے عشق کرنے والے لوگوں (کو اگر نہ بھی پتہ ہو تو ان) کا نام لے کر نہ ہونے والی باتیں بھی ہو جاتی ہیں اور ہو جانی چاہئیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کا اتنا تو لحاظ کرتے ہیں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ سے عشق کرتے ہیں ان کا لحاظ ہونا بھی چاہئے ورنہ فرق کیا ہو گا؟

حضور باباجیؒ صاحب کا ایک اور واقعہ ہے۔ ایک دفعہ میں ان کے پاس ان کے پاؤں کی طرف بیٹھا تھا۔ انہوں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی، پاؤں لمبے کئے اور فرمایا: "زندگی میں پہلی مرتبہ پاؤں لمبے کرنے کی اجازت ملی ہے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ پچاس ساٹھ برس تک آپ پاؤں لمبے کر کے لیٹے نہیں تھے بلکہ دو زانو بیٹھے رہتے۔ یہ بذاتِ خود کتنی بڑی مشقت ہے۔ میں نے حضور باباجیؒ صاحب سے ملنے والے ایسے متعدد لوگ دیکھے ہیں جو دوزانو بیٹھ کے ہی سوتے تھے اور وہاں ہی سے اٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔ اگرچہ یہ عام آدمی کے لئے بڑی مشقت ہے مگر ان

کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسان کر دی تھی۔ جب میری اپنی طبیعت اس طرح کی ذوق والی ہو تو جسم اتنا نرم اور ملائم ہو جاتا ہے کہ گھنٹوں بیٹھا رہوں اور پہلو نہ بدلوں تب بھی کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ حضور باباجیؒ صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ انگیٹھی میں لکڑی کا پکا کوئلہ جل رہا تھا۔ آگ تیز کرنے کے لئے میں نے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے پنکھے کو ہلایا تو یکایک بہت ساری چنگاریاں اڑیں۔ کچھ انؒ کے کپڑوں پر پڑیں۔ کچھ میرے کپڑوں پر۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا:

"جب آگ تیز ہو جائے تو صوفی کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔"

جنگ ۴۸۔۱۹۴۷ء کے دوران ہم تیزی سے (پونچھ سیکٹر میں) آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک مقام پر آکر رک گئے۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کہ بغیر کسی ظاہری سبب کے ہم کیوں رک گئے تھے۔ اس سلسلہ میں مجھے بڑی ذہنی خلش تھی کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس وقت روحانیت کی طرف خیال نہیں تھا بلکہ میں اس کے دنیوی اسباب کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد ایک دن میں حضور باباجیؒ صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا فرمانے لگے:

"آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے قدم پونچھ میں کیوں رک گئے تھے؟ پھر خود ہی فرمایا: وہاں دو ہندو فقیر تھے جنہوں نے چھ سال سے حبس دم کیا ہوا تھا۔ انہوں نے آپ کے قدم آگے نہیں بڑھنے دئے۔" میں نے بعد میں دریافت کروایا تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں فی الواقع ابھی تک ادھر ہی تھے۔"

پھر فرمایا "جب میں راولپنڈی آیا تو اس وقت اس علاقے میں اس قسم کے چھ عدد ہندو فقیر تھے جو مسلمانوں کے لئے تباہی چاہتے تھے۔" پھر مسکرا کر فرمایا "کچھ سی آئی ڈی والے میرے واقف تھے، میں نے ان سے کہا تو انہوں نے ان کو وہاں سے بھگا دیا۔" سی آئی ڈی والوں کی بات یہاں انہوں نے یقیناً اشارتاً کہی۔ بڑے کاملین اسی طرح لپیٹ کر بات کرتے ہیں۔ یہ لوگ راز کی بات اکثر اسی طریقہ سے یعنی بالواسطہ ہی کرتے ہیں۔

پولیس کا ایک بڑا دیوہیکل حوالدار جس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوتی تھیں ہماری

موجودگی میں حضور باباجیؒ صاحب کے پاس آتا رہتا تھا۔ ایک دن قدرے مسکرائے اور اس کو مخاطب کر کے فرمانے لگے:

"آپ نے یہ مونچھیں کیوں رکھی ہوئی ہیں۔ میں تو ان سے نہیں ڈرتا۔"

پھر حضور باباجیؒ صاحب نے ایک واقعہ سنایا، فرمانے لگے: "ایک مرتبہ میں کوہ قاف میں واقع مسجد سلیمان میں گیا۔ وہاں ایک بزرگ تھے جن کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز کے وقت مسجد میں دیو (جنّات کی سب سے بڑی شکل) آ جاتے تھے۔ جب ان کی ایک صف آ کر بیٹھ جاتی تو ایسا لگتا تھا کہ ان سے زیادہ اونچی اور قد آور مخلوق کائنات میں موجود نہیں ہے۔ جب دوسری صف آ کر بیٹھتی تو معلوم ہوتا کہ وہ اس سے بھی اونچی ہے۔ غرضیکہ اس طرح صف در صف کئی صفیں وہ آ کر بیٹھ جاتے اور ہر صف دوسری صف سے اونچی لگتی۔ حضور باباجیؒ صاحب نے فرمایا: "میں تو ان سے بھی نہیں ڈرا۔"

بہرحال اس مخلوق کے مزید حالات کے بارے میں کسی اور مقام پر شاید سالار صاحب نے ذکر کیا ہو۔

حضور باباجیؒ صاحب کی طبیعت میں عاجزی و انکساری بھی بہت تھی۔ جتنا کوئی بلند شخصیت کا مالک ہوتا ہے اتنا ہی عجز و انکساری کرتا ہے۔ جتنا جس کا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے۔ کوئی شخص حضور باباجیؒ صاحب کے جوتوں کو اس ڈر کی وجہ سے ہاتھ نہیں لگاتا کہ اگر وہ جوتے سیدھے کرتا تو اٹھتے وقت حضور باباجیؒ صاحب اس کے جوتے سیدھے کر دیا کرتے۔ ایک بڑے خوش مزاج صاحبزادے حضور باباجیؒ صاحب کے پاس آئے، انہوں نے حضور باباجیؒ صاحب کے جوتے کو سیدھا کیا۔ وہ صاحب اٹھنے لگے تو حضور باباجیؒ صاحب نے ان کے جوتوں کو سیدھا کیا۔ ان صاحب نے جوتا اٹھا کر سر پر رکھ لیا اور کہا "اب میں ان کو پاؤں میں کیسے پہن سکتا ہوں"۔

حضور باباجیؒ صاحب کا کھانا پینا بھی اولیائے کاملین کی طرح بہت کم تھا۔ آخری دس پندرہ سالوں میں تو آپ نے شاید اناج کھایا ہی نہیں۔ عموماً بھنے ہوئے چنے کا آٹا ہوتا تھا۔ جس میں چینی ملا کر چائے یا پانی کے ساتھ چند چمچ کھا لیتے تھے۔ اس سے پہلے سالوں میں ان کے لئے سالن آتا تھا۔ کئی دفعہ دیکھا کہ اس میں سے گوشت کا ایک چھوٹا

سا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر نرم کرتے رہے پھر وہ بھی ساتھ بیٹھے ہوئے کسی دوسرے صاحب کو دے دیا اور خود محض انگلیاں چاٹ لیں۔

مری کے علاقے میں صوم وصلوٰۃ کے پابند ایک تعمیراتی کاموں کے ٹھیکیدار صاحب نے مجھے کھانے کی دعوت دی۔ میں چلا گیا۔ کھانا کھا کر واپس آیا تو حضور باباجیؒ صاحب نے بلایا اور پوچھا کہ کہاں گئے تھے اور وہاں کیا کھایا۔ میں نے جو کچھ کھایا تھا آپ کو بتایا۔ حضور باباجیؒ صاحب کی عادت کا بھی پتہ تھا کہ کوئی شخص کچھ چھپا رہا ہو، نہ بتائے یا بھول جائے تو اس سے مکرّر پوچھتے رہتے تھے، جب تک کہ ساری بات نہ بتا دی جائے۔ میری بات سن کر نہایت سنجیدہ ہو کر فرمانے لگے "دیکھو جی! حرام کھا کر اللہ اللہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

یہ بات سن کر مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ سب لوگ اچھے بھلے مسلمان ہیں ان کے ہاں حرام کہاں سے آ گیا۔ فرمانے لگے کس کا گوشت کھایا ہے؟ میں نے کہا مرغ کا۔ فرمایا کہ کیا کھانے سے پہلے معلوم کیا تھا کہ وہ مرغ ٹھیک طریقہ سے ذبح بھی ہوا تھا۔ ذبح کرنے والے کو تکبیر آتی تھی اور وہ نمازی بھی تھا؟" اس کے بعد مجھ پر تو پابندی لگا دی کہ سفر میں صرف گڑ اور چنے کھالیا کروں۔ میرا زندگی بھر کا تجربہ یہی ہے کہ اگر وہ پابندی کروں تو اس کا بہت فائدہ ہوتا ہے، نہ کروں تو اس سے نقصان ہوتا ہے اور کئی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضور باباجیؒ صاحب کے ہاں کرامت کا اظہار کسی غیر معمولی طریقے سے نہیں ہوتا تھا۔ ایک بڑی بات یہ تھی کہ کرامت کا اظہار معمول کے مطابق روزمرہ طریقوں سے ہوتا رہتا تھا۔

حضور باباجیؒ صاحب کے ہاں ایک بات دیکھی کہ ان کے ہاں ہر قسم کے وظائف کا ذکر ہوتا تھا۔ سابقین، اوّلین و آخرین کا شاید کوئی وظیفہ ایسا ہو جس کا آپ کے ہاں ذکر نہ ہوتا ہو۔ ساتھ ہی آپ اس کو پڑھنے کے طریقے بھی بتاتے تھے جس سے حضورؒ کے حافظے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جو عبارت ایک مرتبہ نظر سے گزری وہ بقول ان کے انہیں زبانی یاد ہو گئی۔ حزب البحر شریف کے بارے میں ہمیں تین چار قسموں کا علم ہے لیکن آپ اس کی ۱۸ قسمیں بتاتے تھے اور ان سب کو اپنے اپنے طریقے سے پڑھا ہوا تھا۔

سرکار والا کے ایک ارشاد کے بارے میں کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وٗ آلہٖ وسلّم نے فرمایا "جس کو اللہ سے محبت ہے وہ تکلیفوں کے لئے تیار ہو جائے۔" اولیائے کاملین میں محبت اللہ تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وٗ آلہٖ وسلّم سے بھی جب کہ کسی نہ کسی درجے میں دونوں اکٹھی بھی ہوتی ہیں۔ البتہ غلبہ کسی ایک کا ہی ہونا چاہئے۔ کسی کو محبت اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہوتی ہے کسی کی حضور صلی اللہ علیہ وٗ آلہٖ وٗسلّم سے۔ اس طرح جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وٗ آلہٖ وٗسلّم سے محبت رکھتے ہیں ان پر اس کے مطابق اثرات مرتب ہوتے ہیں اور جو خدا سے محبت رکھتے ہیں ان پر بھی اس کے مطابق۔ کاملین کے ہاں جس بات کو کمال کی علامت سمجھا جاتا ہے وہ فاقہ ہے۔ حضور باباجیؒ صاحب کے ہاں فاقہ کی بات بہت نمایاں ہوتی تھی۔ ان کے ہاں شاید ہی کوئی ہفتہ اس سے خالی ہوتا ہو۔ خواہ کچھ بھی اہتمام کر لیا جائے اس دن کسی کو کھانے کے لئے کچھ نہیں ملتا تھا۔ تین دن تک تو مجھے بھی یہ سعادت حاصل رہی۔ کچھ واقف حال لوگوں کو جب فاقہ کا معلوم ہوتا تو وہ سمجھ جاتے تھے کہ اصل بات کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی محتاجی کے باعث فاقہ نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت کے باعث ان کو یہ سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ایک حدیث مبارک میں نے پڑھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وٗ آلہٖ وٗسلّم نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کو اسلام کے بعد مومن کا خالی پیٹ رہنا پسند ہے۔"

مشکلات میں کاملین کی طرف رجوع کرنے کا معاملہ بھی اگر سمجھ نہ آئے تو کافی مشکل ہے۔ میں ایک دفعہ ایک چلّہ کے دوران کسی اندرونی مشکل میں پھنس گیا۔ مشکل کوئی ظاہری نہیں تھی۔ اسی دوران بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی۔ ایک بزرگ شخص کو (جن کو میں جانتا تھا) دیکھا۔ ان کے ساتھ بڑی تعداد میں اسی درجہ کے کئی دوسرے کاملین کو بھی دیکھا۔ بلکہ ایسے لگا جیسے وہ سب صف بہ صف کھڑے ہیں۔ ان تمام حضرات نے کمربند باندھ رکھے تھے۔ (تصوّف میں شاید ایک خاص طبقہ ہے جو کمر کے گرد مختلف قسم کے بند باندھتا ہے)۔ کہتے ہیں کہ حضور باباجیؒ صاحب بھی کسی دور میں پیٹی باندھتے تھے بلکہ وہ تو باقاعدہ فوجی طرح کی کراس بیلٹ باندھتے تھے۔ جو اب بھی موجود ہے۔ اس دور کے بھی عجیب واقعات بتائے جاتے ہیں)۔ وہ سب بزرگانِ دین مجھے

مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے کہ تم نے اس کام کے لئے ان (حضور باباجیؒ صاحب) کو کیوں تکلیف دی، ہم لوگ جو اس کے لئے حاضر ہیں۔ اس پر میری آنکھ کھل گئی اور ساتھ ہی وہ مشکل بھی آناً فاناً رفع ہو گئی۔

ساتھی بتاتے ہیں کہ حضور باباجیؒ صاحب نے بہت لمبے لمبے چلّے کئے، ظاہر ہے کہ آپؒ میں اس کی استعداد بھی اسی قدر ہو گی۔ ویسے بھی چلّے کرنا کوئی زور کی بات نہیں ہوتی بلکہ خداداد صلاحیت و استعداد کی بات ہوتی ہے۔ کئی ایسے لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں پتہ لگتا ہے کہ وہ چالیس چالیس دن کا ایک روزہ رکھتے تھے۔ کئی بزرگوں نے چھ چھ مہینے کے روزے رکھے جب کہ کئی حضرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تو زندگی بھر اس طرح کے روزے رکھے۔ ان کے روزوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری طرح پہلے سے زیادہ کھاتے تھے بلکہ ایسے مشائخ حضرات کی بھی کمی نہیں جنہوں نے اس قسم کی چلّہ کشی کے دوران سرے سے کچھ کھایا ہی نہیں۔ اس بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ کیا ایسی چلّہ کشی جائز ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ ایک انسان عرصہ تک کچھ کھائے پئے بغیر زندہ بھی رہ سکے۔ بحث تو ضرور کی جائے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ عمل میں ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ وہ معاملات ہیں جن کی اپنی دنیا ہے اور کوئی دوسرا قاعدہ یا ضابطہ اس پر حاوی نہیں کیا جا سکتا۔

حضور باباجیؒ صاحب کے بارے میں ایک بات نمب والے مولوی صاحب کی زبانی میں نے کئی بار سنی۔ کہتے تھے کہ جب حضور باباجیؒ صاحب کو ہندوستان واپسی اور ڈفرے میں قیام کرنے کا ارشاد ہوا تو آپ نے جواباً عرض کی "وہاں تو بہت بڑے بڑے لوگ ہیں۔ میرا وہاں کیسے گزر ہو گا۔" صاحب ارشاد نے فرمایا: "آپ سب کے حالات سے باخبر ہوں گے مگر آپ کے حالات سے کوئی باخبر نہ ہو گا، کوئی آپ کو کچھ دے گا ہی، لے گا نہیں۔" حضور باباجیؒ صاحب کے مرتبے کی بلندی و عظمت کے لئے اگرچہ یہی ایک واقعہ کافی ہے مگر جن حضرات کو باباجیؒ صاحب کی صحبت کا شرف حاصل رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ محض یہی ایک واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ اس نوعیت کے متعدد واقعات ہیں جن سے ایسا لگتا ہے گویا باباجیؒ صاحب کی ذات خود ایک مراد اور مقصود ہے جس کا انتظار ہو رہا تھا۔ اس واقعہ سے یہ خیال بھی آتا ہے کہ جن صاحب نے باباجیؒ صاحب کے بارے میں یہ

ارشاد فرمایا ان کی اپنی ہستی کتنی بلند ہو گی۔ یاد رہے کہ یہ صاحب ارشاد قطب الاقطاب حضرت خواجہ نورالحسن نینواؒ (عراق) والے تھے۔ ڈفرے والے حضورؒ اوائل عمر میں آپ کے ایک مرید المعروف صوفی صاحب کے ہمراہ جناب خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے تو آپ کھڑے ہو گئے۔ صوفی صاحب نے سمجھا کہ خواجہ صاحب ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "آپ کے لئے نہیں میں اس بچے کے لئے کھڑا ہوا ہوں۔" یہ خیال بھی کچھ غلط نہیں ہو گا کہ سُنّتِ الٰہی میں آخر یہ بھی تو معلوم ہے کہ حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وَآلہٖ وَسلّم کی ذاتِ اقدس اگرچہ آخر میں ظہور پذیر ہوئی مگر وہ اپنے تمام اوّلین کا فخر تھی۔

اگرچہ آخر آمد و بود فخر الاوّلین صلی اللہ علیہ وسلم

کاملین کے حالات میں اس کے نشانات بھی کثرت سے ملتے ہیں کہ کسی کے بارے میں دوسرے کاملین نے فرمایا کہ یہ تو اپنے سابقین کے بھی پیشوا ہیں۔ حضرت غوث الاعظمؒ کی ذات مبارکہ کے بارے میں بھی یہی صورت ہے۔ اس سے آگے کچھ کہنے کا اختیار ہے نہ توفیق۔

حضور باباجیؒ صاحب کے حالات زندگی پر کتاب مرتب کرنے کے لئے سالار صاحب نے جو محنت اور کاوش کی ہے، بڑی قابل تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ ان کی اس محنت و کاوش میں جو چیز زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ انہوں نے ایک ہی واقعہ کو کئی لوگوں سے سنا اور کوشش کی کہ مختلف لوگوں سے اس واقعہ کی تصدیق کی جائے۔ وہ واقعہ جن جن لوگوں سے سنا ہے ان کے بارے میں معلوم کیا جائے کہ ان کی شہرت کیسی ہے اور ان کا تعلق حضور باباجیؒ صاحب کے ساتھ کیسا رہا وغیرہ وغیرہ۔ بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سالار صاحب نے بلاشک وشبہ بڑی ثقہ روایات جمع کی ہیں۔ یہ محض قصے کہانیاں یا سنی سنائی باتیں نہیں ہیں جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ بلکہ یہ واقعات ایسے لوگوں پر گزرے ہیں جن کی خاص تعداد اس وقت موجود تھی اور کئی ایک ابھی بقید حیات ہیں۔ میں خود بھی کئی واقعات کا عینی شاہد ہوں۔ کئی واقعات دوسرے ساتھیوں سے براہ راست سنے ہیں۔ ایک اصولی بات سے دوسری باتوں کی طرف راہنمائی ہوتی ہے۔ اولیائے کاملین کے ہاں ایک اصولی بات ہو تو پتہ ہوتا ہے کہ اس قبیل کی دوسری

اصولی باتیں بھی ضرور ہوئی ہوں گی۔ یہ بات ریکارڈ پر رکھنا چاہتا ہوں کہ یہ تحریر جو لوگ پڑھیں گے ان کو احساس ہونا چاہئے کہ یہ محض کوئی قصے کہانیاں نہیں اور یہ اس فارسی مقولہ کے مصداق بھی نہیں۔

"پیران خود نمی پرند بلکہ ایشاں را مریدان می پرانند"

پیر خود نہیں اڑتے بلکہ مرید ان کو اڑاتے ہیں

بلکہ یہ ایک ایسے عارف کامل کے انتہائی مستند احوال زندگی اور ارشادات عالیہ ہیں جو قربِ الٰہی کی بلندیوں کی طرف نہ صرف خود مسلسل محوِ پرواز رہے (اور غالباً اب بھی ہیں) بلکہ اپنے دامن سے وابستہ افراد کو بھی (ان کے ظرف اور بساط کے مطابق) مختلف مقامات تک پہنچا دیا۔

بقول حضرت سلطان باہوؒ

اول غم ٹکڑے دا میٹے وت رب نال چا ملاوے ہو،

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ارشاد

"لا یشقی جلیسھم"

(ان کا ہم نشین کبھی محروم نہیں رہتا)

کے مصداق آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والا کوئی بھی شخص کبھی محروم نہیں رہا۔ ایک موقع پر جب کہ ہم میں سے کچھ لوگ ایک جگہ بیٹھے دل کی تنگی کا اظہار کر رہے تھے حضور نے بلا بھیجا۔ مجھے مخاطب کر کے سامنے کوئی پچاس گز فاصلے پر ایک جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "ہمارے پاس جب کوئی شخص وہاں آتا ہے تو ہم نے جو کرنا ہے وہیں کر دیتے ہیں۔ البتہ اس کے اظہار کا ایک وقت ہے۔"

حرفِ آخر کے طور پر اس بات کا ذکر بے جا نہ ہو گا کہ ولایت میں کسی ایک طرز کا حصول بھی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے مثلاً یہ کہ کوئی شخص خضری ولی ہو۔ میرا اپنا علم اگرچہ محدود ہے مگر میرا خیال ہے کہ ولایت معرفت کے تین نہایت ہی اہم بلکہ غالب اجزا یا طریقے یا طرز ہیں۔ خضری، قلندری اور اویسی۔ اس کے علاوہ بھی یقیناً کچھ ہوں گے۔ واللہ اعلم۔ تاہم حضرت باباجیؒ صاحب کے حالات زندگی یعنی ان کا طور طریقہ، گفتگو، رہن سہن وغیرہ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ حضور باباجیؒ

صاحب کی ذات میں یہ تینوں قسمیں بدرجہ کمال یکجا جمع تھیں۔ اگرچہ ان کا اظہار اپنے اپنے محل پر علیٰحدہ علیٰحدہ بھی ہوتا تھا۔ یہ وہ منفرد خصوصیت ہے جو ان کو پروردگار نے عطا کر رکھی تھی اس کا کچھ اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ولایت کی ان اقسام کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ کبھی موقع ملا اور زندگی نے وفا کی تو شاید اس پر کسی وقت کچھ لکھنے کی سعادت حاصل ہو جائے۔ بہرحال این سعادت بزور بازو نیست

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

□ ○ □

نوٹ۔ "تعارف" میں سالار صاحب کا ذکر چند بار آیا ہے اس لئے ان کا تعارف بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سالار صاحب کی ڈفریوالے حضورؒ سے وابستگی مستند ہے کہ وہ انہیں کے ہو کر رہ گئے۔ حضورؒ کی سوانح حیات کے لئے جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ "سالار صاحب" کا اصلی نام مزمل الدین ہے۔ ڈھاب پڑی تحصیل و ضلع چکوال پیدائشی جگہ ہے۔